

ہمدردِ نونہال

نومبر ۱۹۵۹ء

-/4/-

پیارے بچوں کا پیارا ساتھی

ہمدرد نونہال کراچی

نمبر:- ۱۱ جلد: ۷

مدیرۂ اعزازی:- ثریا ہمدرد
ایڈیٹر:- مسعود احمد برکاتی

ایک پرچہ: چار آنے
سالانہ ڈھائی روپے

فہرست مضامین

حکیم حافظ محمد یحییٰ پرنٹر پبلشر نے ہمدرد ٹرسٹ کے لیے مشہور پریس میں چھپوا کر دفتر "ہمدرد نونہال" ہمدرد دواخانہ - ناظم آباد - کراچی سے شائع کیا۔

لکڑی کا گھوڑا



(فراز پاشا)

بڑا سست رفتار پھر بھی بھگوڑا
کبھی دُم ہلائی، کبھی سر کو موڑا
تپائی گرادی - صُراحی کو توڑا

ستاتا بہت ہو یہ چلتا ہے تھوڑا
خریدا ہے خالد نے لکڑی کا گھوڑا

گدھے بھی ہیں رفتار میں اس سے آگے
وہ آگے کو بھاگیں، یہ پیچھے کو بھاگے
بندھے ہیں کئی رنگ کے دُم میں دھاگے



اُچکتا ہو جب اس پہ پڑتا ہے کوڑا
خریدا ہے خالد نے لکڑی کا گھوڑا

نہ کھاتا ہے کھانا، نہ پیتا ہے پانی
بڑی ناک والا، بڑا خاندانی
جو سر اس کا اُجلا، تو دُم اسکی دھانی



نہیں کوئی بازار میں اس کا جوڑا
خریدا ہے خالد نے لکڑی کا گھوڑا

تھی کل شب عفیفہ کی گڑیا کی شادی
اُچھل کود کر اس نے بھگدڑ مچادی
ہمیشہ سے ہے یہ شرارت کا عادی



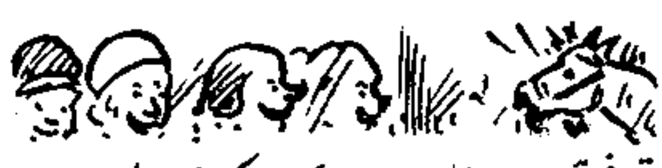
جو رکھا تھا سیٹ چائے کا اس نے توڑا
خریدا ہے خالد نے لکڑی کا گھوڑا

اگر کوئی گردن تھپکتا نہیں ہے!
تو یہ اک قدم بھی سرکتا نہیں ہے!
عجب جانور ہے یہ تھکتا نہیں ہے!



وہیں رُک گیا ہے جہاں اس کو موڑا
خریدا ہے خالد نے لکڑی کا گھوڑا

یہ گڑیوں کی محفل میں جب سج کے آیا
مذاق اس کا باراتیوں نے اُڑایا
جواب اس سے جب کوئی بھی بن نہ پایا



تو غصے میں دیوار سے سر کو پھوڑا
خریدا ہے خالد نے لکڑی کا گھوڑا



ننھے سوار کی انوکھی چال

محمد زکریا مائل

ایک تو انگلستان ہے ہی سرد ملک، پھر جاڑے کے موسم میں وہاں کی سردی! دانت سے دانت بجتے ہیں۔ اس بلا کی ٹھنڈک ہوتی ہے کہ ہاتھ پاؤں برف کی طرح سرد ہونے لگتے ہیں۔ پانی اولے کی طرح جم جاتا ہے۔ لوگ بھاری بھاری گرم کپڑے جسم پر لادے انگیٹھیوں کے پاس بیٹھے رہتے ہیں کہ کسی طرح جسم کو گرمی پہنچائیں، مگر سردی ہے کہ کم ہونے کا نام نہیں لیتی۔

ایک دن ایسا ہی شدّت کا جاڑا پڑ رہا تھا اور اس کے ساتھ پانی الگ برس رہا تھا۔ ان دونوں آسمانی مصیبتوں کا جھیلنا کوئی آسان کام نہ تھا مگر مجبوری عجیب چیز ہے۔ ایک کم عمر انگریز لڑکا اس حالت میں بھی گھر سے نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی منزل کی طرف چل کھڑا ہوا۔

سفر ذرا لمبا تھا۔ سردی پوری شدّت سے محسوس ہو رہی تھی اور اس کے کپڑے پانی سے تربتر ہو رہے تھے، مگر لڑکے نے ہمت نہ ہاری اور سفر جاری رکھا۔ چلتے چلتے جب بہت تھک گیا اور بھوک بھی بہت بے چین کرنے لگی تو اس نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں کہ شاید کوئی ایسا ٹھکانا نظر آجائے جہاں ذرا دم لے لے اور کچھ کھا پی کر بدن کو گرمی پہنچا سکے۔ آخر ایک بڑے فاصلے پر اسے ایک چھوٹا سا ہوٹل دکھائی دیا اور یہ گھوڑے کو تیزی سے بڑھاتا ہوا وہاں جا پہنچا۔

(۲)

اب لڑکے کی جان میں جان آئی۔ اس نے گھوڑا ہوٹل کے نوکر کے حوالے کیا اور خود ہوٹل میں داخل ہو کر ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں بدن کو گرمی پہنچانے کا معقول انتظام ہو۔ اتنے میں اسے انگریزوں کا ایک گروہ نظر آیا جو آتش دان (بڑی انگیٹھی) کے گرد حلقہ بنائے اس پر جھکے بیٹھے تھے اور اِدھر اُدھر کی گپ شپ میں مصروف تھے۔ ان کے اس طرح بیٹھنے سے درمیان میں کوئی جگہ خالی نہ رہی تھی۔ لڑکا یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوا اور اس نے ان لوگوں کے پاس جاکر بڑے ادب سے کہا:

"شریف بزرگو! کیا میں آپ کی مہربانی سے یہ امید کر سکتا ہوں کہ آپ مجھے آگ کے قریب تھوڑی سی جگہ دے دیں گے؟"

ان لوگوں نے سُنی اَن سُنی کر دی ، اس پر ایک حقارت کی نظر ڈالی اور پھر اپنی فضول باتیں چھیڑ دیں ۔ لڑکا غریب یوں ہی سردی کی شدّت سے لرزتا کانپتا رہا ۔

ان کی اس حرکت پر لڑکے کو سخت غصہ آیا اور وہ دل میں سوچنے لگا " کتنے بے رحم اور بے حس ہیں یہ لوگ ! انھیں بس اپنا ہی آرام سوجھتا ہے اور مجھ جیسے کمسن لڑکے پر بھی ترس نہیں کھاتے جس کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ اچھا بات تو جب ہے کہ میں بھی انھیں خوب مزہ چکھاؤں "

(۳)

لڑکا تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر ان لوگوں کے قریب ایک کرسی لے کر بیٹھ گیا ۔ بیرے کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی ۔ جب وہ آیا تو پہلے بہت آہستہ سے اس سے کوئی بات کہی ، اس کے بعد ذرا بلند آواز سے کہا ، " دیکھو میرا گھوڑا بھوکا ہے ، اس کے لیے تڑے میں گوشت اور دودھ پڑی ہوئی چائے پہنچا دو میرے لیے گرم گرم دلیا ، چاول اور روٹی لے آنا "



بیرا چلا گیا ۔ پھر تھوڑی دیر بعد آکر اس انداز سے کہنے لگا کہ وہ لوگ بھی سن لیں " صاحب ! گھوڑے نے گوشت تو کھا لیا مگر چائے نہیں پی " لوگوں نے لڑکے کی الوکھی فرمائش پہلے ہی سن کر تعجب کیا تھا ، اب بیرے کا جواب سنا تو اُف حیران ہوئے کہ گھوڑا گوشت کھاتا ہے اور دودھ پڑی چائے پیتا ہے ! اس کے بعد انھوں نے لڑکے کو بیرے سے یہ کہتے ہوئے سنا ۔

" اچھا چائے کی ضرورت نہیں ، تھوڑی شکر پڑا ہوا قہوہ اس کے لیے لے جاؤ اور ایک سگریٹ سلگا کر اس کے منھ میں دے دو "

(۴)

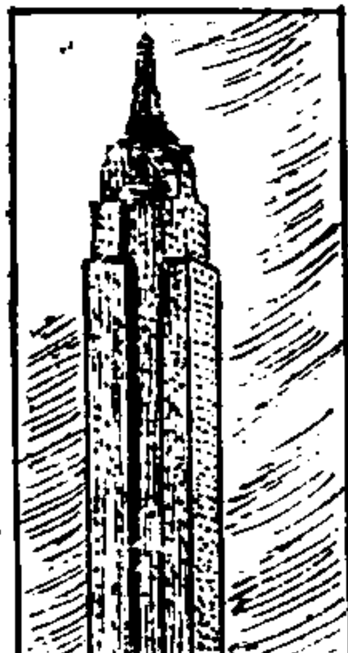
اب تو ان لوگوں نے بڑی حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔ انھیں اس عجیب گھوڑے کو دیکھنے کا شوق بڑی طرح ستانے لگا جو گوشت کھاتا ہے ۔ چائے اور قہوہ پیتا ہے ۔ سگریٹ کا دھواں بھی اُڑاتا ہے ! وہ ایک ایک کرکے اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ باہر جاکر اس انوکھے گھوڑے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آئیں ۔

اِدھر یہ لوگ باہر گئے اُدھر آتش دان کے پاس کی جگہ خالی ہوگئی ۔ لڑکا مزے سے اُٹھا اور اپنی کرسی آگ سے بہت قریب رکھ کر آرام سے تاپنے لگا ۔ اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی

(باقی صفحہ ۸ سو پر)

نسیمہ قاسمی

ایک سو دو منزلہ مکان



ہر سال قریب قریب ڈیڑھ کروڑ سیر و سفر کرنے والے آدمی دنیا کے سب سے اونچے مکان ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ (EMPIRE STATE BUILDING) کو دیکھنے کے لیے جاتے ہیں۔ جب سے یہ مکان بنا ہے ایک کروڑ سے زیادہ آدمی اس کو دیکھ چکے ہیں۔ یہ ایک سو دو منزل کی عمارت ہے۔ اس کا سنگ بنیاد ۱۹۲۹ء میں رکھا گیا تھا اور یکم مئی سنہ ۱۹۳۱ء میں مکمل ہوئی۔ یہ نیویارک (امریکہ) میں ففتھ ایوینیو (FIFTH AVENUE) اور ۳۴۔ اسٹریٹ کے چوراہے پر واقع ہے۔ اس کے نچلے حصے میں دوکانیں ہیں، اوپر کی منزلوں میں کارخانوں، تجارتی کمپنیوں کے دفتر ہیں۔ ادارہ اقوام متحدہ (U.N.O) کے بھی کئی دفاتر اس عمارت میں آگئے ہیں۔ اوپر جانے کے لیے درمیان میں ایک ایسا لفٹ لگا ہوا ہے جو مشکل سے تین منٹ میں ۸۶ ویں منزل پر پہنچا دیتا ہے۔ ۸۶ ویں منزل پر کھلی ہوئی جگہ ہے۔ اس جگہ سے عمارت کے چاروں طرف کی سیر کی جا سکتی ہے۔ اسی منزل پر ایک دکان میں اس عمارت کے نقشے، تصویریں اور چارٹ وغیرہ بکتے ہیں۔ اس عمارت کو دیکھنے اوپر جانے اور سیر کرنے کا ٹکٹ ایک ڈالر ہے۔ اس کو دیکھنے کے لیے اکثر لوگ شام کے وقت آتے ہیں۔

ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کا نقشہ شرلو لیمب اور ہارمن نے بنایا تھا اور ولیم۔ ایف لیمب کی نگرانی میں اس کی تعمیر ہوئی۔ دو ایکڑ زمین پر اس کی تعمیر ہوئی تھی نیویارک کے سب سے زیادہ مصروف علاقہ میں یہ عمارت بنائی گئی ہے، لیکن اس کے بناتے وقت بازار اور کاروبار میں ذرا بھی رکاوٹ نہیں ہوئی اور نہ سواریوں کے آنے جانے میں کوئی خلل پڑا۔ اس عمارت میں جو لوہا لگایا گیا ہے اس کا کل وزن ساٹھ ہزار ٹن تھا۔ اٹلی، فرانس، بلجیم اور جرمنی کی تمام کانوں کا سنگِ مرمر پورے ایک سال تک اس عمارت کے کمروں اور ہالوں میں لگانے کے کام آتا رہا۔ لوہے کے پائپ جو نیچے سے اوپر تک اس میں لگائے گئے ہیں، ان کی لمبائی کل ملا کر پچاس میل ہوگی۔ سڑک سے لے کر آخری منزل (ایک سو دویں منزل) تک ۱۸۶۰

سیڑھیاں ہیں ۔ ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کے تار جو پوری عمارت میں لگے ہوئے ہیں ان کی مجموعی لمبائی تین ہزار دو سو میل ہے ۔ اتنی اونچی عمارت پر سیڑھیوں کے ذریعہ چڑھنا آسان نہیں ہے اس لیے اس میں ۷۰ سے زیادہ لفٹ لگا دیے گئے ہیں ۔

اس عمارت کے اوپر ٹاور میں سرکاری رصدگاہ ہے ۔ رصدگاہ میں موسم کا مشاہدہ کیا جاتا ہے ۔ اس کاارپری منزل میں تین ہزار بلب لگے ہوئے ہیں ۔ ایک آدمی روزانہ صرف یہی کام کرتا ہے کہ جو بلب خراب ہوجائیں ان کو بدل دے ۔ تین سو سے زیادہ ملازم صرف عمارت کی صفائی کے لیے رکھے گئے ہیں ۔ اس عمارت کے نیچے کے بڑے دروازے میں سے روزانہ پچاس ساٹھ ہزار آدمی گزرتے ہیں ۔ عمارت میں جو دفتر اور دکانیں ہیں ان کی ڈاک تقسیم کرنے کے لیے ڈاک خانہ کی طرف سے چار ڈاکیے مقرر ہیں جو تقریباً ساٹھ تھیلے ڈاک روزانہ تقسیم کرتے ہیں عمارت میں چار ہزار چھ سو کھڑکیاں ہیں ، جن کو صاف کرنے کے لیے سات ملازم مقرر ہیں ۔ یہ ملازم روزانہ لٹک لٹک کر کھڑکیوں کی صفائی کرتے ہیں تو عام لوگ دیکھ کر ڈرنے لگتے ہیں مگر وہ ملازم عادی ہوگئے ہیں ۔

سیکڑوں پرندے اس عمارت سے ٹکرا ٹکرا کر مرجاتے ہیں ۔ ایک دفعہ تو ایک بمبار طیارہ بھی اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا تھا ۔

بقیہ اگر میں قمیض کے اندر ہوتا

کتنی موٹی تازی مرغی ہے ۔

"میں اسے اچھے داموں بیچوں گا ۔"

"آخر کتنے میں بیچو گے ؟"

"پانچ رُپے میں ۔"

"ساڑھے تین لے لو ۔"

"جی نہیں "

"چار لے لو "

"جی نہیں "

غرض اسی طرح یہ مول تول ہوتا رہا ۔ گاہک نے ساڑھے چار تک دام لگا دیے ۔ اتنے میں ملّاجی کی آنکھ کھل گئی ۔ نہ مرغی تھی نہ گاہک کا پتہ تھا ۔ ملّاجی نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور ہاتھ بڑھا کر بولے "اچھا تو لاؤ ساڑھے چار ہی دے دو ۔"

پہاڑی ندی



کوہ سے ندی چلی آتی ہو لہراتی ہوئی
بے خودی میں ڈگمگاتی جھومتی گاتی ہوئی
اپنی ہی رفتار پر ہوتی ہوئی خود ہی نثار
اپنی موسیقی پہ خود ہی وجد میں آتی ہوئی
چرخِ نیلی فام کا حیرت سے منھ تکتی ہوئی
آرہی ہو آئینہ تاروں کو دکھلاتی ہوئی
اُونچے نیچے کوہچوں سے چھیڑ کرتی کھیلتی
چھوٹے چھوٹے پتھروں کو ساتھ لڑھکاتی ہوئی
ڈھال سے گزری پھسلتی لڑکھڑاتی کودتی
موڑ پر رکتی ہوئی، ٹیلوں سے ٹکراتی ہوئی
کوہ کے سینے پہ ہر لحظہ مچلتی لوٹتی
وہ چلی آتی ہو دیکھو بل پہ بل کھاتی ہوئی
جیسے بجلی سوتے سوتے لے رہی ہو کروٹیں
جیسے اک ناگن سفید آتی ہو لہراتی ہوئی
جیسے اوندھا دے منوں پگھلی ہوئی چاندی کوئی
اک پری جیسے چلی آتی ہو اٹھلاتی ہوئی
موتیوں کو اس کا ہر قطرہ خجل کرتا ہوا
سنگ ریزوں کی چمک ہیروں کو شرماتی ہوئی

حامد اللہ افسر

انڈر گراؤنڈ ریلوے



قیصر مراد آبادی

دنیا کے بہت سے حصّوں اور شہروں میں زمین کے اندر بھی ریل چلتی ہے۔ اسی کو زمین دوز یا انڈر گراؤنڈ ریلوے کہتے ہیں۔ ساری دنیا کی زمین دوز ریلوں میں، سب سے زیادہ شہرت لندن کی انڈر گراؤنڈ ریلوے کو حاصل ہے۔ ہمارے ملک سے جو لوگ لندن پہنچنے کے بعد اس ریل کو دیکھتے یا اس میں سفر کرتے ہیں، وہ اس کی بڑی تعریفیں کرتے ہیں۔

جب لندن جانے والوں کا بسوں اور موٹروں میں بیٹھ کر شہر کی سیر و تفریح سے جی بھر جاتا ہے، تو وہ انڈر گراؤنڈ ریلوے کا رخ کرتے ہیں۔ اس وقت وہ زیر زمین ریلوے کا اتنا بڑا کاروبار اور انتظام دیکھ کر واقعی حیران رہ جاتے ہیں۔ زمین کے اندر دو سو ستر ریلوے اسٹیشن نہایت خوب صورت بنائے گئے ہیں سگنلوں کے مرکز قائم ہیں۔ یہ مرکز دنیا کے سب سے بڑے اور جدید نظام پر کام کرنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ ایک ایک مرکز کی مدد سے ۳۴ میل لمبی پٹری کی دیکھ بھال اور ۱۶ پلیٹ فارموں کی نگرانی کی جا سکتی ہے۔

لندن سے باہر علاقوں میں آنے جانے کی سہولت صرف اسی ریلوے کی بدولت حاصل ہے۔ زمین کے اندر ہی اندر کوئی ڈھائی سو میل تک ریل کی پٹریوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ دوسرے ملکوں کی زمین دوز ریلوں کے مقابلے میں لندن کی یہ ریل سب سے قدیم ہے اور کافی طویل اور آرام دہ مانی جاتی ہے۔ زمین کے اندر دو طرح کی ریلیں چلتی ہیں۔ ایک وہ جن کے آنے جانے کے لیے دو سرنگیں بنائی گئی ہیں اور دوسرے وہ جو ایک ہی سرنگ میں صرف ایک جانب چلتی ہیں۔ ریل کی لائن فولاد کی بنی ہوتی ہے۔ سرنگیں تقریباً ڈھائی سو فٹ گہری رکھی گئی ہیں، مگر بعض بالکل گلی کی سطح کے برابر نظر آتی ہیں۔ پٹریوں کی چوڑائی ہمارے ہاں کی بڑی لائن (BROAD GAUGE) کی طرح ہے، لیکن گاڑیوں کے ڈبے بہت نیچے نیچے بنائے گئے ہیں جیسے بالکل پہیّوں سے ملا دیئے گئے ہوں۔ ڈبّوں کی چھت گول ہوتی ہے تاکہ سرنگوں میں گاڑیاں آسانی سے گزر سکیں۔

مرکزی علاقوں میں جب مسافروں کی کثرت ہوتی ہے، تو لندن کی یہ ریلیں ہر جگہ صرف نوّے سیکنڈ

کے وقفہ سے مسافروں کو ملتی رہتی ہیں۔ راستے میں کوئی گاڑی کسی اسٹیشن پر ۲۰ سیکنڈ سے زیادہ نہیں ٹھہرتی۔ یہ گاڑیاں بجلی سے چلتی ہیں اس لیے ان کی رفتار عام طور پر تیز سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ ان کی رفتار عموماً ۲۰ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ زمین کے اندر جگہ کی کمی اور گاڑیوں کے جلدی جلدی آنے جانے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گاڑیاں بہت تیز چل رہی ہیں۔

صبح اور شام دفتروں کے وقت مسافروں کی بڑی ریل پیل ہوتی ہے۔ ان اوقات کے علاوہ دن بھر یہ گاڑیاں مسافروں کو بڑے آرام سے سفر کراتی پھرتی ہیں۔ دن میں روزانہ کوئی ۲۰ لاکھ مسافر ان کے اندر سفر کرتے ہیں۔ سال بھر میں مسافروں کی تعداد ساٹھ پینسٹھ کروڑ تک پہنچ جاتی ہے۔ مسافروں کو زمین دوز اسٹیشن تک پہنچنے کے لیے زیادہ دور نہیں چلنا پڑتا اور نہ ریل تبدیل کرنے کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ لندن کے باشندے حیرت انگیز طور پر جلد جلد اِدھر اُدھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ دور دور کے علاقے ان کے لیے نزدیک ہو گئے ہیں۔

گاڑیوں کے ڈبوں میں نشستوں پر نرم نرم گدّے لگے ہوئے ہیں۔ کھڑکیاں خوب کشادہ ہیں دروازے خود بخود کھلتے اور بند ہو سکتے ہیں، مگر صرف گارڈ انھیں کھولتا اور بند کرتا ہے۔ سرنگ سے نکل کر جب کبھی ریل میدان میں آتی ہے تو بجلی کے ذریعہ ڈبوں کو اندر سے گرم رکھا جاتا ہے۔ ہر ڈبے میں چالیس آدمیوں کی نشست کا انتظام ہوتا ہے اور ۶۰ آدمی کھڑے ہو کر سفر کر سکتے ہیں۔

تقریباً آج سے سو سال پہلے دنیا کا سب سے پہلا انڈر گراؤنڈ اسٹیشن لندن ہی میں بنایا گیا تھا۔ ریل گاڑی کی ایجاد سنہ ۱۸۲۹ء میں ہوئی۔ اس کے غالباً تیس ہی سال بعد لندن میں زمین دوز ریل بھی چلنے لگی۔ ریل کی رفتار سے بھی زیادہ تیز ریل کی یہ ترقی بھی تو ہے کہ اس کی ایجاد کے بعد صرف تیس سال کے اندر زمین کے اوپر چلتے چلتے ریل زمین کے اندر بھی چلنے لگے؟

شاید یہ واقعہ بھی کچھ کم دل چسپ نہیں ہے کہ سنہ ۱۸۲۹ء میں انگلستان کے مشہور انسان جارج اسٹیفینسن (GEORGE STEPHENSON) نے جو سب سے پہلی ریل بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کی، تو وہ بہت چھوٹی سی تھی۔ خود انگلستان والے اسے دیکھ کر ڈر گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انجن بھاپ سے پھٹ جائے گا، اس کے اندر بیٹھنے والے ہلاک ہو جائیں گے، اور یہ ایجاد ہرگز کامیاب نہ ہوگی۔ مگر ریل گاڑی کی قسمت میں تو اتنی بڑی ترقی لکھی ہوئی تھی۔

پھر تم خود بھی اندازہ کر سکتے ہو کہ ساری دنیا کی سواریوں میں آج سب سے زیادہ مفید اور کار آمد، کم خرچ بالا نشین سواری ریل گاڑی کے علاوہ اور کون سی ہے؟



ریچھ کی کھال

اطہر صدیقی

بہت زمانہ گزرا، ایک سپاہی تھا جو جنگ میں بہت بہادری سے لڑ چکا تھا، لیکن جب جنگ ختم ہوگئی تو اُسے ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اب اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے، کیوں کہ لڑائی کے علاوہ وہ کوئی دوسرا ہنر نہ جانتا تھا اُس کے ماں باپ مر چکے تھے اور اُس کا اپنا کوئی گھر بھی نہ تھا۔ وہ اپنے بھائیوں کے پاس پہنچا اور ان سے کہا کہ وہ اُسے اپنے یہاں اس وقت تک رہنے کی اجازت دے دیں، جب تک کہ وہ کوئی دوسرا کام تلاش کر سکے۔ لیکن اس کے بھائی انتہائی سخت دِل تھے۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ مجبوراً بے چارے نے اپنی بندوق کندھے سے لٹکائی اور کسی کام کی تلاش میں چل پڑا۔

وہ کچھ ہی دور چلا تھا کہ اُسے ایک چراگاہ نظر پڑی، جس کے بیچوں بیچ بہت سے گھنے درخت لگے ہوئے تھے۔ وہ ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر بہت مایوس اور مغموم سا اپنی قسمت اور مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا، میرے پاس نہ تو پیسے ہیں، نہ کوئی کاروبار ہو اور نہ ہی مجھے لڑنے کے علاوہ کچھ آتا ہے جو کچھ کرکے پیٹ پال سکوں۔ میری قسمت میں تو شاید بھوک سے مرنا لکھا ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے کچھ کھٹکا سنا۔ نظر اُٹھائی تو اپنے سامنے ایک اجنبی کو دیکھا جو ایک لمبا سا سبز کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے کہا، "میں جانتا ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو، تمھیں جتنی دولت کی ضرورت ہے، مل سکتی ہے، لیکن پہلے میں یہ یقین کر لینا چاہتا ہوں کہ تم واقعی بہادر ہو کیوں کہ میں بزدلوں کو کبھی کچھ نہیں دیتا۔" سپاہی نے جواب دیا، "سپاہی اور بزدل؟ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے! ۔ تم میرا ہر طرح امتحان لے سکتے ہو۔" اجنبی نے کہا، "اچھا تو ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو!" سپاہی نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا ریچھ دہاڑتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ سپاہی نے فوراً بندوق اٹھائی اور فائر کر دیا۔ ریچھ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اجنبی نے کہا، "تم یقیناً باہمت ہو، لیکن ابھی کچھ اور بھی شرائط ہیں جو تمھیں پوری کرنی ہوں گی۔" سپاہی نے کہا، "میں ہر شرط پوری کرنے کو تیار

ہوں" اجنبی نے بتایا کہ وہ شیطان ہے اور ان شرائط کو مان لینے کے بعد سپاہی ایک مقررہ مدّت تک اس کا پابند رہے گا اور اُسے برابر پیسہ ملتا رہے گا۔ سپاہی نے پوچھا، "وہ شرائط کیا ہیں؟" اجنبی نے جواب دیا، "تم سات سال تک نہ نہاؤ گے نہ منھ دھوؤ گے نہ بالوں میں کنگھا کرو گے اور نہ ہی ناخن کاٹو گے! میں تمھیں ایک کوٹ اور ایک لبادہ دوں گا جو تم ہر وقت پہنے رہو گے! اگر تم اس مدت میں مرگئے تو تمھاری لاش پر میرا قبضہ ہو جائے گا اور اگر تم سات سال کے بعد بھی جیتے رہے تو میری ہر قسم کی شرط سے آزاد رہو گے اور تمام دولت تمھاری ہوگی" سپاہی نے سوچا "سات برس بہت زیادہ تو نہیں ہوتے، کیوں نہ اس طرح میں اپنی غریبی کا خاتمہ کردوں۔ یہ سوچ کر اس نے شیطان کی شرطیں مان لیں۔ پھر شیطان نے اپنا سبز کوٹ اتار کر سپاہی کو دیا اور کہا "جب تک تم اس کوٹ کو پہنے رہو گے۔ اس کی جیبوں سے رُپیہ پیسہ نکالتے رہو گے۔ اس کی جیبوں میں تمھیں ہمیشہ ضرورت سے زیادہ دولت ملے گی" اور پھر اس نے ریچھ کی کھال اتار کر اُسے دیتے ہوئے کہا، "یہ تمھارا لبادہ بھی ہے اور بستر بھی۔ اسے تم ہر وقت اوڑھے رہو گے!" یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔

سپاہی نے کوٹ پہن لیا اور جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا کہ کہیں شیطان نے اُسے دھوکا تو نہیں دیا۔ لیکن شیطان کی بات غلط نہ تھی۔ اُسے اپنی جیبیں اشرفیوں سے بھری ہوئی ملیں۔ اُس نے ریچھ کی کھال سے اپنا جسم ڈھک لیا اور شہر کی طرف چل پڑا۔ شروع شروع میں تو لوگ اُسے محض ایک سادھو سمجھتے رہے، لیکن رفتہ رفتہ اس کی گندگی کی وجہ سے دُور بھاگنے لگے۔ دو سال گزرنے کے بعد اس کی شکل انتہائی بھیانک ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ سر کے بالوں سے تقریباً ڈھک گیا تھا۔ اس کی داڑھی بری طرح بڑھ گئی تھی۔ اُس کے منھ پر گرد اور مٹّی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ ناخن لمبے لمبے ہوگئے تھے۔ لوگ اب اس سے خوف کھانے لگے تھے۔ اب اس نے غریبوں اور محتاجوں میں پیسہ بانٹنا شروع کردیا۔ وہ ان سے کہتا، میرے لیے دُعا کرو میں سات سال تک زندہ رہوں اور اس دوران میں مَر نہ جاؤں"

جب اس کی شرط کا چوتھا سال چل رہا تھا تو وہ گھومتا گھامتا ایک سرائے میں پہنچا لیکن سرائے کے مالک نے اُسے اصطبل میں بھی جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ اُسے خیال تھا کہ گھوڑے بھی اس کو دیکھ کر ڈر جائیں گے۔ لیکن جب سپاہی نے اسے اشرفیاں دکھائیں تو اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور بالکل پیچھے کا ایک کمرہ رہنے کو دے دیا، مگر اس شرط پر کہ وہ کم از کم دن میں ہرگز کمرے سے باہر نہ نکلے گا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کی نظر پڑ جائے اور سرائے بدنام ہو جائے

ایک دن شام کے وقت جب کہ وہ بیٹھا ہوا دعا مانگ رہا تھا کہ کسی طرح یہ سات سال

پورے ہو جائیں، اُس نے کسی کے رونے کی آواز سنی۔ وہ بہت ہی رحم دل تھا، رونے کی آواز سن کر بے چین ہو گیا۔ مگر سرائے کے مالک سے اپنی شرط کا خیال کرکے چپ رہا۔ جب رونے کی آواز مسلسل آنے گئی تو وہ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ برآمدے میں ایک بوڑھا آدمی اپنے ہاتھوں میں سر دیے بُری طرح رُو رہا ہے۔ بوڑھا آدمی اس کی آہٹ پر چونکا اور دیکھتے ہی ڈر کر بھاگ نکلا۔ لیکن جب سپاہی نے اسے انسانوں کی طرح اپنے قریب بُلایا تو بوڑھا ٹھہر گیا۔ سپاہی نے بوڑھے آدمی سے بہت ہمدردی اور دوستی کی باتیں کیں اور ہر طرح اس کی ڈھارس بندھائی۔ جب بوڑھے کا خوف قدرے کم ہوا تو سپاہی نے اس سے رونے کی وجہ پوچھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک تجارت کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ رات اس کا تمام مال و اسباب چوری ہو گیا۔ اب اس کے پاس نہ سرائے کا بل ادا کرنے کے لیے پیسے ہیں اور نہ گھر واپس جانے کے لیے۔ سرائے کا مالک جیل بھجوانے کی دھمکی الگ دے رہا ہے۔ سپاہی نے فوراً سرائے کے مالک کو بُلایا اور بل ادا کر دیا۔ اس کے علاوہ بھی بوڑھے آدمی کو بہت سا رُوپیہ دے دیا۔ بوڑھے آدمی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کا شکریہ کیسے ادا کرے اور کس طرح اس احسان کا بدلہ چکائے۔ آخر کار اس نے کہا: "تم میرے ساتھ میرے گھر چلو میری تین لڑکیاں ہیں، تینوں بہت خوبصورت ہیں۔ اگر تم ان میں سے کسی سے شادی کرنا چاہو تو میں بخوشی اس کے لیے تیار ہوں اور خود لڑکیوں کو بھی اعتراض نہ ہوگا۔ کیوں کہ میں انھیں جاکر بتاؤں گا کہ تم نے ہمارے ساتھ کتنا بڑا احسان کیا ہے۔" سپاہی بوڑھے کے ساتھ چل دیا۔ گھر پہنچ کر پہلے بوڑھے نے اپنی بڑی لڑکی کو بلایا لیکن وہ سپاہی کی خوفناک شکل دیکھتے ہی بھاگ گئی۔ دوسری لڑکی نے بھی صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں ایسے شخص کو اپنا شوہر کیسے بنا لوں جو آدمی معلوم ہی نہیں ہوتا۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ میں کسی سرکس کے ریچھ سے شادی کر لوں۔ وہ کم از کم ناچ کر ہی میرا دل بہلائے گا۔ سب سے چھوٹی لڑکی شادی کے لیے تیار ہو گئی۔ اس نے کہا، "یہ شخص یقیناً بہت اچھا آدمی ہوگا، جب ہی اس نے ہماری مدد کی ہے۔ اس لیے ہمیں بھی اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے۔"

تب سپاہی نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر اس کے دو ٹکڑے کیے۔ ایک ٹکڑے پر اپنا نام لکھوا کر لڑکی کو دے دیا اور دوسرے پر لڑکی کا نام لکھوا کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور پھر لڑکی سے کہا "میں تین سال کے لیے تم سے جدا ہو رہا ہوں اگر میں واپس آ گیا تو ہماری شادی ہو جائے گی اور اگر واپس نہ آ سکوں تو سمجھ لینا کہ مر گیا ہوں چاہے جس سے شادی کر لینا۔ خدا سے دعا کرو کہ میں مزید تین سال تک زندہ رہوں اور اس مصیبت سے چھوٹ جاؤں۔ تم اس انگوٹھی کے ٹکڑا کو بہت حفاظت سے اپنے پاس رکھنا۔"

یہ کہہ کر سپاہی روانہ ہو گیا۔

آخرکار ساتویں سال کا آخری دن بھی آپہنچا۔ سپاہی پھر اسی چراگاہ میں اُن پیڑوں کے درمیان پہنچ گیا، جہاں اس کی شیطان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ایک زور دار ہوا کے جھونکے کے ساتھ شیطان آموجود ہوا۔ وہ بہت جھنجلایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے غصّے سے سپاہی کے کپڑے اس کی طرف پھینکے اور اپنا سبز کوٹ واپس مانگا۔ سپاہی نے کہا " ایک منٹ ٹھہرو۔ پہلے تم مجھے اچھی طرح نہلاؤ۔ میرے سر میں کنگھی کرو اور میرے ناخن کاٹو " شیطان مجبوراً اس کا حکم بجا لایا۔ اب سپاہی سات برس پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت جوان نظر آرہا تھا۔ اس نے شیطان کا کوٹ واپس کیا اور شہر کی طرف چل دیا۔ یہاں اس نے بہت قیمتی اور خوب صورت کپڑے پہنے اور ایک گاڑی میں بیٹھ کر اپنی ہونے والی بیوی کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں اُسے کوئی نہ پہچان سکا۔ لڑکیوں کا باپ اُسے ایک بڑا افسر سمجھا جو شاید اس کی کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ اُسے اس کمرے میں لے گیا جہاں لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ انھوں نے اس کی خوب خاطر مدارات کی۔ بوڑھے کی دونوں بڑی لڑکیاں مستقل اس سے باتوں میں مشغول رہیں اور اس کی خوب صورتی اور اس کے لباس کی تعریف کرتی رہیں۔ لیکن اس کی ہونے والی بیوی ایک معمولی سا سیاہ لباس پہنے نظریں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ جب کھانا کھا چکے تو بوڑھے نے اس سے پوچھا کہ وہ کیوں آیا ہے؟ کیا وہ اس کی کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے؟ سپاہی خاموش رہا لیکن دونوں بڑی لڑکیاں اپنے لباس تبدیل کرنے کے لیے چلی گئیں تاکہ اچھی طرح سج بن کر اس کے سامنے آئیں۔

تھوڑی دیر بعد بوڑھا آدمی بھی اُٹھ کر چلا گیا۔ اب سپاہی نے اپنی جیب سے انگوٹھی کا آدھا ٹکڑا نکال کر لڑکی کو پیش کیا۔ لڑکی نے پہلے تو حیرت سے اُسے دیکھا، پھر جلدی سے دوسرا آدھا ٹکڑا، جسے اُس نے اپنے گلے میں ڈال رکھا تھا نکال کر اس سے ملایا۔ تب سپاہی نے اس سے کہا کہ میں ہی تمھارا شوہر ہوں، جسے تم نے ریچھ کی کھال میں دیکھا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس مصیبت سے نجات مل گئی اور میں اپنی اصلی شکل میں آگیا۔ اسی وقت اتفاق سے دونوں بڑی لڑکیاں کمرے میں واپس آئیں اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ یہ امیر اور خوب صورت اجنبی وہی ریچھ کی کھال والا شخص ہے، جس سے انھوں نے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ان کی چھوٹی بہن شادی پر تیار ہو گئی تھی، تو انھیں بہت افسوس ہوا اور اپنی بے وقوفی اور بدقسمتی پر کڑھتی ہوئی واپس چلی گئیں اور پھر چند روز بعد بوڑھے آدمی نے اپنی چھوٹی لڑکی کی شادی بڑی دھوم دھام سے سپاہی کے ساتھ کر دی جو اب ایک بڑا آدمی تھا۔



ملکوں ملکوں کے بچّے

بالشتیوں کے بچّے

حامد اللہ افسر

جنوبی افریقہ میں جہاں بڑے بڑے بے آب و گیاہ صحرائی میدان ہیں وہاں بڑے بڑے گھنے جنگل بھی ہیں، ان میں سے ایک جنگل بہت گنجان اور تاریک ہے یہ بڑا پُراسرار جنگل ہے اور "افریقہ کا گرم جنگل" کہلاتا ہے، اس جنگل میں بہت ہی کم انسان یا جانور رہ سکتے ہیں، وہاں جو چند قبیلے آباد ہیں ان میں سے ایک بالشتیوں کا قبیلہ بھی ہے، یہاں کے آدمیوں کا قد عام طور پر چار فٹ کا ہوتا ہے، اسی لیے جنگل کا یہ حصّہ "بالشتیوں کی سرزمین" کہلاتی ہے۔

وہاں دھوپ بہت تیز پڑتی ہے اور بارش بہت زیادہ ہوتی ہے اور قریب قریب سارے سال ہوتی رہتی ہے اور جنگل کا زیادہ حصّہ پانی سے بھر جاتا ہے۔

کہیں کہیں درختوں کو کاٹ کر کھلی ہوئی جگہ نکال لیتے ہیں اور بالشتیے اپنی اوندھی سیدھی جھونپڑیاں ڈال لیتے ہیں جو بہت چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں، بالشتیے بالکل وحشی ہوتے ہیں اور زہریلے تیروں کے ذریعہ جانوروں کا شکار کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔

بالشتیے تقریباً ننگے رہتے ہیں، عورت مرد سب صرف لنگوٹ باندھے رہتے ہیں، وہ بہت تیز تیز بولتے ہیں ان بےچاروں کو وہاں نمک نہیں ملتا، نمک ان کے لیے بڑی نعمت ہے، جو لوگ دنیا کے مہذّب حصّوں سے افریقہ کے اس جنگل میں جاتے ہیں وہ ان کے لیے نمک ضرور لے جاتے ہیں، اس سے وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور گھنٹوں ناچتے رہتے ہیں، لوہا بھی اس جنگل میں کمیاب ہے، ان علاقوں میں جانے والے لوگ بڑے بڑے چاقو بھی بالشتیوں کو تحفہ میں دے دیتے ہیں۔ اگر تم بالشتیوں کی بستی میں جاؤ تو ابھی تم میلوں فاصلے پر ہوگے کہ انھیں تمھارے وہاں آنے کی خبر ہو جائے گی اور جب تم ان کی جھونپڑیوں کے پاس پہنچو گے تو وہاں کسی کو نہ پاؤ گے، وہ آس پاس کے درختوں میں جاکر چھپ جاتے ہیں، اور جب تک اس بات کا یقین نہیں ہو جاتا کہ تم ان کے دشمن نہیں ہو وہ نہیں آتے۔

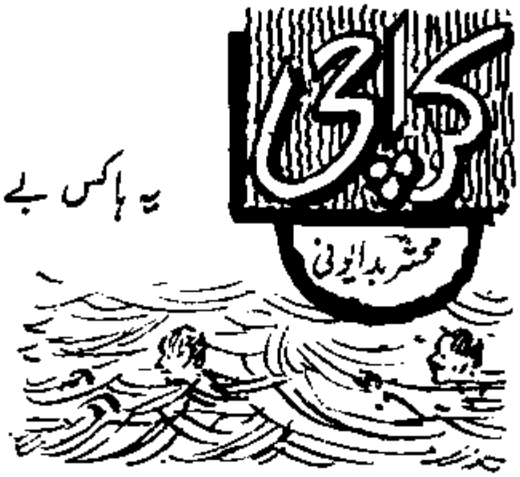
بالشتیوں کے بچّے نسبتاً اور سب قوموں کے بچّوں سے چھوٹے ہوتے ہیں ان کے بچّے بالکل

ننگے رہتے ہیں اور بہت گندے ہوتے ہیں، ان کا رنگ کالا ہوتا ہے مگر حبشیوں کی طرح بہت کالا نہیں ہوتا۔ بالشتیے اپنے بچوں کو کچھ سکھاتے نہیں اور سکھائیں بھی تو کیا سکھائیں، ان کی زندگی ایک مصیبت کی زندگی ہوتی ہے، سال کے زیادہ حصّے میں بہت تیز بارش ہوتی رہتی ہے اور جنگل کی زمین ایک خوفناک دلدل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں شکار ناممکن ہو جاتا ہے، یہ لوگ کھیتی باڑی بھی نہیں کرتے، وہ ایک جگہ جم کر رہتے بھی نہیں اسی لیے وہ مضبوط قسم کی جھونپڑیاں بھی نہیں بناتے، جہاں انھیں شکار ملتا ہے وہاں چلے جاتے ہیں، ان کا قبیلہ ایک خانہ بدوش قبیلہ ہے۔

بالشتیے ناچنا بہت پسند کرتے ہیں، وہ اپنے بدن پر سفید، سُرخ اور زرد روغن مل لیتے ہیں اور عجب عجب قسم کے ڈھول گلے میں لٹکا لیتے ہیں، ان میں جو لوگ جوان ہوتے ہیں وہ ایک گھیرا بناکر ناچتے ہیں، نرسنگے اور تالیاں بجاتے جاتے ہیں، بوڑھے آدمی ذرا فاصلے پر بیٹھتے ہیں اور تال دیتے رہتے ہیں، وہ ایک قسم کے ڈھول بھی بجاتے رہتے ہیں جن پر بندر کی کھال منڈھی رہتی ہے، ڈھول تیز سے تیز تر بجتا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ناچ میں بھی تیزی آتی جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ سب کے سب پاگل ہوگئے ہوں، وہ عجیب عجیب طرح کے منھ بناتے ہیں اپنے سفید سفید دانت باہر نکالتے ہیں۔ زمین پر پیر پٹکتے ہیں، یہاں تک کہ انتہائی تیزی کے ساتھ ڈھول بجتے بجتے اور ناچتے ناچتے وہ اِک دم سے رُک جاتے ہیں اور زمین پر تھک کر گر پڑتے ہیں۔

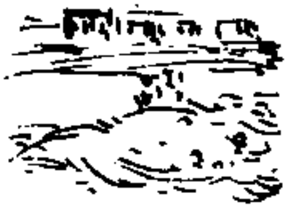
اصل میں یہ لوگ بالکل جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں نہ انھیں خدا کا علم ہے اور نہ وہ تہذیب و شائستگی سے آگاہ ہیں۔

مگر ان سب باتوں کے باوجود ان کے بچّے بہت خوش اور چونچال معلوم ہوتے ہیں اصل میں یہ عادت کی بات ہے۔ وہ اسی قسم کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں اور اسی میں خوش ہیں، اگر تم انھیں پکڑ کر اسکول میں بھرتی کر دو تو ان کی جان مصیبت میں پڑ جائے۔



کہتی ہیں نانی بتاتے ہیں نانا
شہرِ کراچی بڑا ہی پُرانا

یہ ہاکس بے اور یہ ہے کلفٹن　　ساحل سے کرلو سمندر کے درشن



اندر کو دھڑ ہے تو باہر کو گردن
دیکھو یہ پانی میں لوٹیں لگانا
کہتی ہیں نانی بتاتے ہیں نانا
شہرِ کراچی بڑا ہی پُرانا

فُٹ پاتھ والوں کی چالیں ہیں لنگڑی　　مضبوط جسموں پہ پوشاک تگڑی

نو گز کی شلوار دس گز کی پگڑی





دھو دھو کے ہو جائے دھوبی دِوانا
کہتی ہیں نانی بتاتے ہیں نانا
شہرِ کراچی بڑا ہی پُرانا

چھَن چھَن چھَنا چھَن چلے اونٹ گاڑی　　آگے سے ترچھی تو پیچھے سے آڑی

ٹاورے منٹوں میں پہنچے کماڑی





گاڑی میں بیٹھا ہے پورا گھرانا
کہتی ہیں نانی بتاتے ہیں نانا
شہرِ کراچی بڑا ہی پُرانا

سڑکوں پہ دن بھر قیامت کا اودھم　　لے لوجی مولی خریدو جی شلغم

دن بھر بسوں اور ٹراموں کا ماتم





راتوں کو گلیوں میں کُتّوں کا گانا
کہتی ہیں نانی بتاتے ہیں نانا
شہرِ کراچی بڑا ہی پُرانا

دیکھو ذرا بلڈنگوں کی یہ شانیں　　اوپر مکان اور نیچے دُکانیں

بند اِن مکانوں میں ہیں کتنی جانیں





کمرے کو دیکھو تو چڑیوں کا خانا
کہتی ہیں نانی بتاتے ہیں نانا
شہرِ کراچی بڑا ہی پُرانا

سائنس کی باتیں ۵

حامد اللہ افسر



جاندار چیزوں کی سائنس

یہ بات تو اب تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو کہ انجن کچھ قاعدوں کی پابندی کرتے ہیں اور سیارے گھڑی کی طرح باقاعدہ پابندی کے ساتھ آسمان میں گشت لگاتے ہیں اور روشنی جب وہ عدسے یا عینک کے شیشے میں سے گزرتی ہو اور آئینہ میں سے منعکس ہوتی ہو تو کچھ مقررہ اصولوں پر عمل کرتی ہو اور حرارت اور بجلی اور آواز اور سب بے جان چیزیں قاعدوں کی پابندی کرتی ہیں، لیکن شاید تمھارا خیال یہ ہو کہ جاندار چیزیں سائنس کے حدود سے باہر ہیں اور جاندار چیزوں کو قاعدوں اور مقررہ اصولوں کی پابندی نہیں کرنی پڑتی، مگر تمھارا یہ خیال غلط ہو، ذرا غور کرو تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ جانداروں کی دنیا میں بھی سائنسی نظام اور ضابطے اور لگے بندھے قاعدے موجود ہیں، مثلاً جب تک بیج نہ بویا جائے پودا نہیں اُگتا، کبھی کبھی دیواروں میں سے یا ایسے قطعات میں سے جہاں بہ ظاہر بیج بونے کا امکان معلوم نہیں ہوتا پیڑ پودے اُگ آتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہو کہ یہ پیڑ پودے بھی بیجوں ہی سے اُگے ہیں، یا تو ہوا سے اڑ کر یہ بیج وہاں پہنچتے ہیں اور دیواروں کی درزوں اور پکے فرش کے شگافوں میں یہ بیج پہنچ جاتے ہیں اور پھوٹ نکلتے ہیں یا چڑیاں ان بیجوں کو وہاں پہنچا دیتی ہیں۔ غرض کوئی پودا بغیر بیج کے نہیں اُگتا، اور ہر قسم کے پودے کے الگ الگ اور مخصوص بیج ہوتے ہیں اور جب وہ بیج بویا جاتا ہو اور اسے پانی اور دوسری چیزیں جن کی اسے ضرورت ہو دی جاتی ہیں تو پودا نکلتا ہو اور نشوونما پاتا ہو۔ بیج کو پانی کے علاوہ ہوا کی بھی ضرورت ہوتی ہو۔ تم کہوگے کہ بیج تو زمین کھود کر مٹی میں دبایا جاتا ہو وہاں ہوا کیوں کر پہنچ سکتی ہو؟ بات یہ ہو کہ تھوڑی سی ہوا ہمیشہ پانی کے اندر بھی موجود رہتی ہو اور جب بیج کو پانی دیا جاتا ہو اور وہ پانی بیج تک پہنچتا ہو تو پانی کے ساتھ ہوا بھی بیج تک پہنچ جاتی ہو، اس کا عملی امتحان کرنا چاہو تو یہ کرو کہ دو گملوں میں الگ الگ بیج بو دو، ایک گملے میں تو معمولی سادہ پانی ڈالتے رہو اور دوسرے گملے میں پانی کو اُبال کر اور اس کی ہوا نکال کر اور اُسے ٹھنڈا کرکے گملے میں ڈالو، جس گملے میں معمولی پانی ڈالا گیا ہو اُس میں پودے پھوٹ نکلیں گے اور جس میں اُبلا ہوا پانی ڈالا گیا ہو اُس

یں پودے نہیں نکلیں گے۔ کیوں کہ اس گملے کے بیجوں تک ہوا نہیں پہنچی ہے، اسی طرح پودے اور بہت سے قاعدوں کی پابندی کرتے ہیں، مثلاً چاہے تم بیج کو الٹا سیدھا، ٹیڑھا میڑھا کسی طرح بودو جب اس بیج سے پودا پھوٹے گا تو زمین کے اوپر ہی آئے گا یہ نہیں ہوگا نیچے کی طرف جائے۔

اسی طرح کیڑے مکوڑے اور حشرات انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں، معمولی گھاس کے پتّوں میں حشرات کے ہزاروں انڈے چمٹے رہتے ہیں، تھوڑی سی گھاس لے کر اُسے ٹھنڈے گرم پانی میں ایک آدھ ہفتے پڑا رہنے دو، تم دیکھو گے کہ پانی بہت میلا ہوگیا اور اس میں ہزاروں ننھے ننھے کیڑے پیدا ہوگئے، یہ کیڑے اتنے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں کہ اگر تم دس بارہ کیڑے ملا کر رکھو تو ایک نقطے کے برابر جگہ میں آئیں گے، یہ کیڑے تمھیں بغیر خوردبین کے نظر نہیں آئیں گے۔

گھاس والے کیڑے سے بھی چھوٹے کیڑے ہوتے ہیں اتنے چھوٹے کہ ایک انچ میں ہزارہا کیڑا آجائے گا۔ یہ کیڑے بھی کسی اچھے خوردبین ہی سے دیکھے جا سکتے ہیں، ان کیڑوں کو جراثیم کہتے ہیں، ان کی بعض قسمیں ایسی ہیں کہ جب وہ انسان کے خون میں پہنچ جاتی ہیں تو کوئی بیماری پیدا ہوجاتی ہے، ان کیڑوں کی ایک قسم سے سل یا دق کا مرض پیدا ہوجاتا ہے، دوسری قسم سے طاعون اور ایک اور قسم سے ہیضہ پیدا ہوجاتی ہے، اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیماریوں کے بھی بیج ہوتے ہیں جو ہوا میں اڑتے رہتے ہیں اور جب وہ ہمارے جسم میں کوئی کمزور جگہ پاتے ہیں تو وہاں نوآبادیاں قائم کرلیتے ہیں لیکن اگر ہم صاف رہیں اور ہمارے خون میں طاقت ہو اور ہم چست و تن درست ہوں تو ان کیڑوں کا بس نہیں چلتا اور وہ اپنی نوآبادی قائم نہیں کرسکتے۔

اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ بیماریوں کے سائنٹی فک اسباب ہیں جن کا مطالعہ کرکے معالج نہ صرف ان کا علاج کرسکتے ہیں بلکہ انھیں روک بھی سکتے ہیں۔ ہم خود بھی ان جراثیم سے محفوظ رہنے کے لیے بہت کچھ کرسکتے ہیں، اگر ہم منھ سے سانس نہ لیں اور جب کوئی زخم وغیرہ ہو تو اُسے صاف رکھیں اور کھلا نہ رہنے دیں، اور تازہ ہوا حاصل کرنے کی کوشش کریں اور مکھیوں سے کھانے کی چیزوں کو محفوظ رکھیں تو جراثیم ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جاندار چیزوں کی بھی سائنس ہے۔ سائنس کی اس شاخ کا نام "حیاتیات" ہے، جو شاخ صرف پودوں سے متعلق ہے اُسے "نباتیات" کہتے ہیں اور جو جانداروں سے متعلق ہے اُسے "حیوانیات" کہتے ہیں۔

وحیدہ نسیم

آئسکریم کب بنی تھی؟



اوہو۔ ارے بھائی آئسکریم کا نام سن کر تو تمھارے منھ میں پانی ہی بھر آیا۔ خیر تمھاری جگہ میں ہوتی تو شاید رال ہی ٹپک پڑتی اور یہی سوچنے لگتی کہ کب بنی تھی، کس کے گھر بنی؟ کیا ہی اچھا ہو، اگر آئسکریم اپنے گھر بھی ہو، لیکن میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تم سے سوال کروں کہ آئسکریم تمھارے ہاں کب بنی تھی اور آخری بار تم نے کب کھائی تھی؟ اگر کھا کر عرصہ گزر گیا ہو تو میں تم کو کھلا دوں! پوچھنا تم سے یہ ہے کہ کبھی تم نے یہ سوچا ہے کہ اس دنیا میں آئسکریم سب سے پہلے کہاں بنی ہوگی! دنیا کی ساری ایجادات، مثلاً ریڈیو، گراموفون، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، سب کے بارے میں تم کچھ نہ کچھ جانتے ہی ہوگے، لیکن آئسکریم اتنی مزیدار چیز ہے کہ اس کے کھاتے وقت تم کیا، کوئی شخص بھی نہیں سوچتا ہوگا کہ یہ کب ایجاد ہوئی ہوگی؟

اکثر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ آئس کریم موجودہ دور کی صنعت ہے، لیکن تمھیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہ قبل مسیح ایجاد ہو چکی تھی۔ سکندرِ اعظم یونانی، جس نے ہندستان پر حملہ کیا تھا (جب پاکستان پیدا نہیں ہوا تھا) اور ٹیکسلا (پنجاب) کے علاقہ میں راجہ پورس کو شکست دی تھی، آئس کریم بنانے کی ترکیب اور مزے سے اچھی طرح واقف تھا، وہ نہ صرف خود اس کو کھاتا تھا، بلکہ اپنے دوست احباب کو بھی دعوتوں کے موقعوں پر کھلایا کرتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ آئس کریم ذائقہ اور شکل میں ہماری موجودہ آئس کریم کی طرح نہ تھی، لیکن تھی آئس کریم ہی۔

سکندرِ اعظم سے قبل آئس کریم کس کے ہاں بنی تھی؟ یہ تو دریافت نہ ہو سکا، لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ اس زمانے میں یونان کی دعوتوں میں اس کا استعمال عام تھا۔ برف بنانے کے کارخانے، فریجڈیئر، مشینیں اس زمانے میں موجود نہ تھیں، لیکن بادشاہوں اور نوابوں کے ہاں خادموں، نوکروں اور غلاموں کی کوئی کمی نہ تھی۔ کھانے پینے کے دلدادہ، اپنے غلاموں کو برف پوش پہاڑوں کے اوپر بھیج کر برف منگوایا کرتے تھے۔ یہ برف بڑے بڑے کمبلوں میں لپیٹ کر لائی جاتی تھی تاکہ سورج کی گرمی سے پگھل نہ جائے۔ برف کو عرصے تک محفوظ رکھنے کے لیے اس کو تہہ خانوں میں دفن کر دیتے تھے۔ آئسکریم

کی تیاری اتنی آسان نہیں تھی، جتنی کہ آج کل ہے۔ اسی لیے یہ صرف شاہی دعوتوں میں جمائی جاتی تھی، اس کے لیے بڑی بڑی شیشے کی صُراحیاں یا بوتلیں استعمال ہوتی تھیں، جن میں خالص دودھ شہد کے ساتھ ملا کر بھر دیتے تھے۔ ان صُراحیوں کو یا تو برف کی سِلوں میں دفن کر دیتے تھے یا پھر غلام اور نوکر ان کو برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے اندر جو ایک بڑے سے طشت میں رکھے ہوتے تھے، ان کو ہلاتے رہتے تھے۔ گویا آج کل آئسکریم بنانے کی گھریلو مشینیں اس قدیم اصول پر بنائی گئی ہیں جن میں ایک برتن میں دودھ شکر بھرا ہوتا ہے، اس کے گرد برف کے ٹکڑے بھرے ہوتے ہیں۔ نواب یا بادشاہ آئسکریم کو ذائقہ دار بنانے کے لیے اس میں انگور یا دوسرے پھلوں کا رس بھی شامل کرلیا کرتے تھے۔ برف کو پہاڑیوں پر سے لانا آسان کام نہ تھا، اس کو محفوظ رکھنے کا خاص طریقہ تھا، اس لیے معمولی آدمی آئسکریم کے ذائقہ سے واقف نہ تھا۔

پیارے بچو! یہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ یونان اور روم (اٹلی) تمدّن کے اعتبار سے قدیم ترین ملک ہیں۔ یونان میں تو آئسکریم کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ بس یہ معلوم ہے کہ سکندرِ اعظم کے دربار میں یہ شاہی دعوتوں میں عام تھی، لیکن روم میں آئسکریم "مارکوپولو" نے پہنچائی۔ یہ سیّاح جب سیاحت کرتے کرتے چین پہنچا تو وہاں کے بازاروں میں عام طور پر آئسکریم کو فروخت ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کا کہنا ہے کہ چین میں آئسکریم تین ہزار سال قبل مسیح بن چکی تھی۔ یورپ پہنچ کر مارکوپولو نے آئسکریم بنانے کی ترکیب صرف خاص خاص شاہی باورچیوں کو سکھلائی۔ یورپ میں اس وقت تک اس کا رواج عام نہ تھا، جس کو بنانے کی ترکیب معلوم تھی۔ انھوں نے اس صنعت کو اتنا چھپایا کہ یہ راز اپنے ساتھ ہی لے کر قبر میں دفن ہوگئے۔ تمھیں یہ جان کر تعجب ہوگا کہ یورپ کے شاہی باورچیوں نے اس کو اتنا چھپایا کہ "مارکوپولو" کے دو سو سال بعد آئسکریم کا مزا لوگ بھول گئے خدا جانے ان لوگوں نے کس طرح اتنی مزے دار چیز کو برسوں تک ایسا چھپایا کہ کئی ایک انسانی نسلیں بغیر اس کا مزا چکھے گزر گئیں۔ خیر چھوڑو ان لوگوں کو جو بغیر آئسکریم کھائے مرگئے۔ سوال یہ ہے کہ پھر یہ صنعت زندہ کیونکر ہوئی؟ واقعہ یہ ہوا کہ جب روم کی ملکہ کیتھرائن کی شادی ہنری دوم کے ساتھ ہوئی تو اس نے شاہی جہیز میں آئسکریم بنانے کی ترکیب بھی عجوبہ اور نادر سمجھ کر دے دی اور یہی خیال کیا گیا کہ اب یہ شاہی خاندان تک محدود رہے گی۔ لیکن "ہنری دوم" کو یہ عجیب و غریب چیز بہت پسند آئی، اس نے بار بار اس کو بنوایا، یہاں تک کہ یہ صنعت اب فرانس والوں کے ہاتھ لگ گئی اور انھوں نے اس میں نئے نئے ذائقے شامل کیے، نئی نئی ترکیبیں آئسکریم جمانے اور برف کو محفوظ رکھنے کے لیے سوچی گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آئسکریم پورے یورپ میں چھاگئی، لیکن انگلستان والے اس سے بے خبر بیٹھے رہے۔

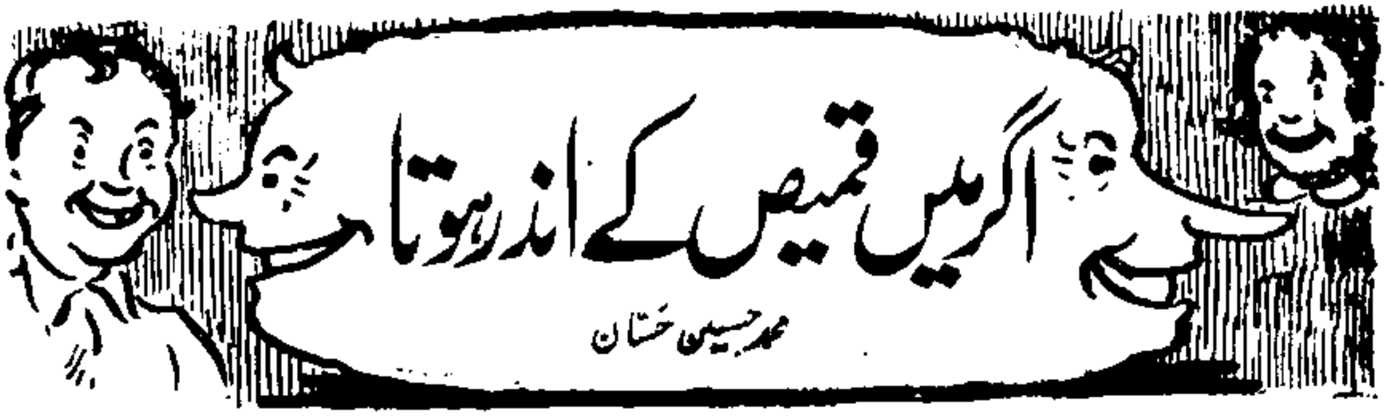
انگلستان میں آئس کریم یورپ کے بعد پہنچی۔ سب سے پہلے انگلستان میں اس کو "شارل اوّل" نے چکھا۔ سُنا گیا ہے کہ اس کے پاس ایک اطالوی باورچی تھا، جو آئس کریم بنانے کی ترکیب جانتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے آقا کی خوشنودی کے لیے آئس کریم بنائی۔ "شارل اوّل" کو یہ چیز اتنی مزیدار معلوم ہوئی کہ اس نے اپنے باورچی سے وعدہ لے لیا کہ وہ یہ بیش بہا ترکیب کسی اور کو نہ بتائے گا۔ اس اطالوی باورچی نے شارل کی زندگی تک اپنا عہد نبھایا لیکن اس کی موت کے فوراً بعد آئس کریم بنانے کی پوری ترکیب بھاری قیمت پر فروخت کردی۔ اس کے بعد انگلستان میں بھی یورپ کی طرح اس کا رواج عام ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ساری دنیا پر چھا گئی۔ چناں چہ اب کوئی ریسٹوران، اس سے خالی نہیں۔ سستی، مہنگی، جیلی والی، پھلوں خوبانی والی، تین رنگوں والی، پف والی، ہر قسم کی آئس کریم عام ہے۔ اس کی ادنیٰ سی شکل "آئس فروٹ" ہے۔ قدیم ہندستان میں یہ صنعت قلفی ملائی کی شکل میں موجود تھی۔ اب سب سے زیادہ آئس کریم ممالک متحدہ امریکا میں تیار ہوتی ہے۔ ۶۵۰ میں وہاں پچاس لاکھ چھ ہزار پونڈ آئس کریم خرچ ہوئی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ اب دس سال بعد یہ حساب کچھ اور بڑھ گیا ہوگا۔ امریکا میں یہ صنعت اپنے عروج پر نظر آتی ہے، وہاں آئس کریم بنانے کے جتنے بڑے کارخانے ہیں، کسی اور جگہ نہیں، چناں چہ وہاں ایک اوسط درجے کی آئس کریم بنانے والے کی تنخواہ سات سو ڈالر تک پہنچ جاتی ہے۔ ان کارخانوں میں کام کرنے والے لوگ اب بھی قطب شمالی کے باشندوں کی طرح اپنے آپ کو گرم لبادوں میں چھپائے ہوئے، اس برفانی گھر میں جس کو آئس کریم کا کارخانہ کہتے ہیں، قدم رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کو گرم غذاؤں اور ورزشوں سے اپنی صحت کا توازن برقرار رکھنا پڑتا ہے۔

بقیہ ڈاکٹر صاحب

میرے صفدر کا قاتل ...... میرے اکلوتے بچے کا قاتل ...... میرا اکلوتا لڑکا ...... آہ!" ایک چیخ مار کر وہ پاگل جنگلوں میں گھس گیا۔

ڈاکٹر صاحب کی نظروں کے سامنے شام کا وہ منظر پھر گیا جبکہ پہلی بار ان کی رشید صاحب سے ملاقات ہوئی تھی اور رشید صاحب انھیں بلا کر لے گئے تھے، اور پھر صفدر کی موت، ایک ایک کرکے سارے واقعات فلم کی طرح ان کی نظروں کے سامنے آ گئے اور وہ ماضی کے خیالات میں کھو گئے۔

سورج نے بادلوں کے غلاف سے منھ نکال کر دنیا پر ایک نظر ڈالی۔ ذرّہ ذرّہ چمکنے لگا، اور بارش سے بھیگی ہوئی تارکول کی سیاہ سڑک پر شمس منور جھلملانے لگا۔ ڈاکٹر صاحب ماضی کے خوابوں سے بیدار ہو گئے اور اپنی میز پر رکھے ہوئے کاغذات میں سے ایک کو اپنی طرف کھینچ لیا۔



یہ دل چسپ کہانیاں، لطیفے اور چٹکلے چین کے یوگھر (UIGHUR) لوگوں میں بہت مشہور اور مقبول ہیں۔ ذرا انھیں پڑھ کر دیکھیے کس قدر دل چسپ کتنی مزے دار ہیں، جیسے اپنے ہی دیس کے قصے ہوں۔ فرق بس اتنا ہے کہ ہمارے ہاں اس طرح کی کہانیوں میں شیخ چلی یا بوجھ بجھکڑ کا نام آتا ہے اور ان چینی کہانیوں میں ملا نصرالدین آفندی صاحب گل کھلا رہے ہیں۔ کہیں کہیں تو بالکل ایسا لگتا ہے جیسے شیخ چلی نے ملا نصرالدین آفندی کا چولا بدل لیا ہے۔ تمہاری دل چسپی کے لیے کچھ قصے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

اگر میں اس قمیص کے اندر ہوتا

ایک دن ملا آفندی کی بیوی نے ملا جی کی قمیص دھو کر سوکھنے کے لیے آنگن میں لٹھے پر ٹانگ دی۔ اس دن رات کو ملا آفندی گھر پہنچے تو تھکن سے چور تھے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سیدھے کمرے میں پہنچے اور بستر پر لیٹتے ہی خرّاٹے لینے لگے۔ آدھی رات کو آنکھ کھلی۔ کسی ضرورت سے آنگن میں گئے۔ چراغ کی دھیمی روشنی میں ملا جی کو قمیص پر چور کا دھوکا ہوا۔ الٹے پیروں لوٹے بندوق سنبھالی۔ نشانہ تاکا اور لبلبی دبا دی۔ سردیوں کی رات تھی قمیص کچھ اکڑ گئی تھی ذرا سی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ نیچے گر گئی۔

بندوق کی آواز سے بیوی ہڑبڑا کے جاگ اٹھیں۔ ملا جی نے انھیں اطمینان دلایا، "آنگن میں چور گھس آیا تھا۔ میں نے اس کے گولی مار دی اب وہ تمھیں دوبارہ پریشان نہ کرے گا۔ اس کی لاش صبح کو ٹھکانے لگا دی جائے گی۔"

اس دن ملا جی تڑکے ہی اٹھ بیٹھے۔ آنگن میں جا کر دیکھا تو دوسرا ہی ماجرا نظر آیا۔ ان کی بندوق کا شکار خود ان کی اپنی قمیص تھی۔ بس پھر کیا تھا مارے خوشی کے اچھل پڑے۔ بار بار اپنی رانوں پر ہاتھ مارتے تھے اور بیوی سے کہتے تھے "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرو ذرا سوچو تو گولی لگتے وقت میں اس قمیص کے اندر ہوتا تو تم کب کی بیوہ ہو چکی تھیں۔"

آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں

ایک دفعہ رات ہو گئی تھی۔ ملا آفندی ایک قبرستان سے گزر رہے تھے۔ اتنے میں چار سوار گھوڑا دوڑاتے

اسی طرف آتے دکھائی دیئے۔ ملّا جی کے دل میں یہ ہول سمائی کہ یہ سوار مجھے کہیں پریشان نہ کریں۔ چپکے سے ایک نئی قبر میں گھس گئے۔ ادھر سواروں نے بھی انھیں قبر میں گھستے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی پریشان ہوئے کہ یہ کس قماش کا آدمی ہے۔

قریب آئے تو بڑی زور سے ڈانٹا "کون ہو تم ؟"

ملّا جی نے قبر میں سے سر نکالا اور بولے "جناب میں ایک مردہ ہوں اور مجھے اس قبر میں دفنایا گیا ہے"

سواروں نے کہا "مگر اس وقت رات میں مُردے کا قبر سے باہر نکلنے کا کیا کام ہے ؟"

ملّا جی بولے "بس ذرا تازہ ہوا کھا رہا تھا"

سواروں نے کہا "اچھا تو گویا مُردے کو بھی تازہ ہوا کی ضرورت ہے !"

شیخ جی کچھ لاجواب ہو گئے ہکلا ہکلا کر بولے "ج ...جی ...آ ...آپ ...ٹھی ...ٹھیک ...کہتے ہیں ...م ...میں غلطی پر ہوں"

ملّا جی گدھے پر !

ملّا آدنتی کے پاس ایک گدھا تھا۔ یہ بہت سست اور بڑا اَڑیل تھا۔ ایک ایک انچ گھنٹوں میں سرکتا تھا۔ ایک دن ملّا جی کے ایک دوست نے دیکھا کہ ملّا جی گدھے پر سوار کہیں جا رہے ہیں اس نے پوچھا "کدھر کے ارادے ہیں ؟"

ملّا جی نے جواب دیا "جمعہ کی نماز پڑھنے جامع مسجد جا رہا ہوں"

دوست کو بڑا اچنبھا ہوا "جمعہ کی نماز پڑھنے ؟ مگر آج تو جمعرات ہے ملّا جی۔ کیوں جمعرات ہی ہے نا ؟"

ملّا جی بولے "ہاں ہاں بھئی جمعہ تو کل ہے مگر اس گدھے کو نہیں دیکھتے کتنا سُست کتنا اَڑیل ہے، اگر کل جمعہ کی نماز تک منزل پر پہنچ جائے تو غنیمت جانو"

پھر میں اسے کیوں بیچوں ؟

ملّا آدنتی کے گھر ایک گائے پلی تھی۔ یہ دودھ نہیں دیتی تھی۔ مرکھنی بھی تھی۔ ملّا جی کی بیوی اسے بیچنا چاہتی تھیں۔ ملّا جی اسے بازار لے گئے۔ گاہک آتے گائے کو دیکھتے اور سودا کیے بغیر اپنا راستہ لیتے۔ ملّا آدنتی بھی تو برابر یہ آواز لگا رہے تھے "تمھیں اس گائے سے ایک قطرہ بھی دودھ نہ مل سکے گا۔ ہاں یہ تمھیں اپنے سینگوں سے زخمی کر سکتی ہے"

بھلا کون ایسا آنکھوں کا اندھا گانٹھ کا پورا گاہک ہوگا جو اِن تعریفوں کے بعد گائے کو خریدنے

کی ہمت کرے گا۔

ایک مویشیوں کا دلال تھوڑی دیر تک یہ آوازیں سنتا اور ملّا جی کے بھولے پن کے مزے لیتا رہا آخر اس نے ملّا جی سے کہا۔" ارے بھئی ملّا جی لائیے میں آپ کی گائے بیچ دوں۔"

ملّا جی خوش ہوکر بولے۔" بھائی آپ تو بہت ہی مہربان معلوم ہوتے ہیں۔ خدا آپ کا بھلا کرے لیجیے آپ ہی اسے بیچ ڈالیے۔"

ملّا جی نے گائے کی رسّی دلال کے ہاتھ میں دے دی۔

دلال نے گائے کی رسّی ہاتھ میں لیتے ہی یہ ہانک لگائی۔" ذرا اس گائے کو دیکھنا کتنی نیک، کتنی سیدھی سادی ہے۔ روز ۱۵ پیالے دودھ دیتی ہے۔ اسے خرید کر تمھیں ہرگز پچھتانا نہ پڑے گا۔"

یہ سننا تھا کہ ملّا جی نے گائے کی رسّی دلال سے لے لی اور بولے۔" اگر یہ بھیڑ کے بچّے سے بھی زیادہ سیدھی ہے اور روزانہ پندرہ پیالے دودھ دیتی ہے تو پھر میں اسے کیوں بیچوں، اسے خود اپنے پاس کیوں نہ رکھوں۔"

ملّا جی کی انگوٹھی

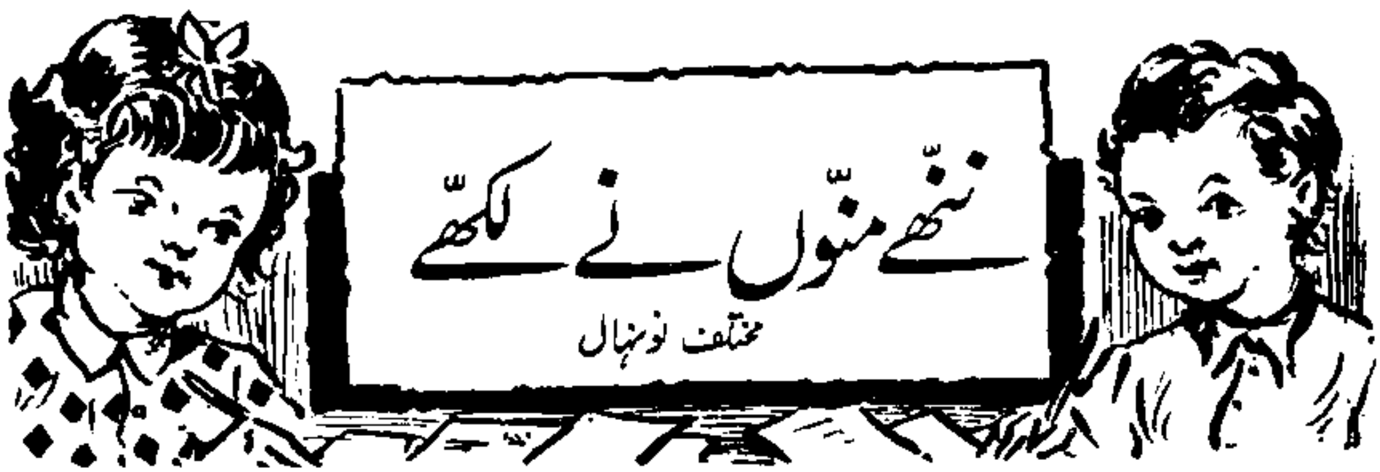
ملّا جی کے ایک سوداگر دوست ایک بار بہت لمبے سفر پر جا رہے تھے۔ روانگی سے پہلے ملّا جی سے ملنے آئے۔ ملّا جی اس وقت سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھے۔ سوداگر کا جی للچا گیا۔ اور اسے ہتھیانے کی ترکیب سوچنے لگے۔ بولے۔" ملّا جی نہ جانے کب لوٹنا ہو اور کب آپ کی دوبارہ زیارت ہو۔ بیچ جانیے اتنے دنوں آپ کی جدائی مجھے بے قرار رکھے گی۔ اپنی دوستی کا صدقہ مجھے یہ انگوٹھی دے دیجیے جب بھی اس پر میری نظر پڑے گی مجھے ایسا محسوس ہوگا جیسے آپ مجھ سے بالکل قریب ہیں۔ اور اس طرح مجھے بہت راحت اور سکون نصیب ہوگا۔"

مگر بے چارے ملّا آدمی کو ساری عمر میں بس یہی ایک قیمتی چیز نصیب ہوئی تھی۔ اسے وہ کسی قیمت پر بھی جدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے جواب دیا۔" میں تمھاری اس محبّت کا بہت احسان مند ہوں مگر تم سے اتنے دنوں تک جدائی مجھے بھی چین نہ لینے دے گی۔ اس لیے میرے بھائی مجھ پر رحم کھائیے یہ انگوٹھی میرے ہی پاس رہنے دیجیے۔ جب کبھی اس انگوٹھی پر نظر جائے گی اور بدا کے یہ خیال آئے گا کہ میرے ایک دوست نے مجھ سے انگوٹھی مانگی تھی اور میں نے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح تمھاری یاد میرے دل میں برابر تازہ رہے گی۔"

ملّا جی کا خواب

ایک دفعہ ملّا آدمی نے خواب دیکھا، وہ ایک مرغی بیچ رہے ہیں اور گاہک کو بتا رہے ہیں کہ کتنی بھاری

(باقی صفحہ ۶ پر)



ننھّے منّوں نے لکھّے

مختلف نونہال

لیکن...!

شگفتہ سلیم۔ کراچی

میرے بھائی جان بھی بس ..... اب کیا بتاؤں کہ وہ کیسے ہیں؟..... مگر وہ ہیں کہ روزانہ ہاں ہاں کرکے بہلا دیتے ہیں اور میں خاموش ہوجاتی ہوں۔ آپ ہی سوچیے کیا میں ان کے خیال کے مطابق اتنی ہی چھوٹی ہوں کہ اس طرح ان کے بہکانے میں آتی رہوں۔

لیکن؟.... لیکن ان کی باتیں، ان کے وعدے۔
ان کے آگے تو میں عجیب چکر میں پڑ جاتی ہوں،
عجیب الجھن میں.....!

اپنی پچھلی فرمائشوں کے ساتھ اگلی فرمائشوں کی فکر پڑ جاتی ہے.... کیوں؟ یہ چیز آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ حالاں کہ مجھے اس وقت اپنے پر بہت غصہ آتا ہے.... مجھے کم از کم اپنی پچھلی ہی فرمائش پوری کرالینی چاہیے۔ یہ کئی بار میں نے سوچا۔ لیکن بھائی جان کے سامنے تو.... میں کیوں ایسا نہیں کر پاتی؟

میں نے اُن سے کسی عمدہ سے کپڑے کے متعلق کہا کہ آجکل بازار میں نائلون کی چھینٹیں بڑے بڑے عمدہ ڈیزائن کی آرہی ہیں۔ ایک فراک کی ہمیں لادیجیے اور وہ بہت محبت اور بڑے پیار سے ہمیں جواب دیتے، ہاں بھئی میں کل بازار جاؤں گا اور تمھارے لیے ضرور لادوں گا۔

لیجیے، ایک ہفتہ گزرنے کے بعد ان کو یاد آیا نوٹ کرلیتا ہوں۔

اور تو کچھ نہیں چاہیے۔ اچھا بی بی ذرا اپنا بستہ تو دکھاؤ! ــــ چھی چھی ــــ کیسا میلا ہو گیا اور پھٹ بھی تو گیا۔ اچھا ہم تین چیزیں لائیں گے اور ایسی اچھی ــــ بس تم.....

اتنی ساری چیزیں..... میں خوشی سے پھولی نہ سمائی!

نیا سال آگیا۔
بھائی جان کی نئی ڈائری آگئی!
لیکن......؟

فقیر

نزہت سلطانہ۔ کومیرا۔ چاٹگام

نسیم اور انور دونوں دوست میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ امتحان قریب تھا اس لیے رات

کے وقت دونوں پڑھائی کی غرض سے اسکول جاتے تھے۔ ایک مرتبہ دونوں رات کے وقت اسکول سے فارغ ہوکر گھر جا رہے تھے۔ نسیم کو جو شرارت سوجھی تو اس نے ایک اندھیری گھپ گلی میں آواز لگائی۔

"ہے کوئی سخی جو اندھے محتاج کو کھانا کھلادے"

اتنے میں ایک گھر سے نسوانی آواز آئی "ٹھہرو بابا کھانا لاتی ہوں" انور تو کسی قدر گھبرا گیا اور بھاگنا چاہا لیکن نسیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا، "بزدل مت بنو، ہمت سے کام لو! مفت میں روز روز کھانا کہاں..... ملتا ہے، اب تو کھاکر ہی چلیں گے۔"

اسی اثنا میں ایک صاحبہ دونوں ہاتھوں میں پلاؤ کی دو پلیٹیں لے کر آگئیں اور دونوں وہیں دروازے میں بیٹھ کر کھانے لگے۔ سردیوں کے دن تھے۔ دونوں کمبل اوڑھے ہوئے تھے۔ دوسرے دروازے میں موم بتی جلنے کی وجہ سے کوئی خاص روشنی بھی نہ تھی اس لیے ان صاحبہ کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ دونوں فقیر ہیں یا طالب علم۔ انور خلافِ تہذیب بڑے بڑے نوالے بناکر جلدی جلدی کھا رہا تھا کہ جیسے یہ اس کا اپنا ہی گھر ہے، یہاں تک کہ انور کی ساری پلیٹ ختم ہوگئی اور نسیم نے آدھی پلیٹ ہی خالی کی۔ انور چوں کہ جلدی جلدی کھاکر پلیٹ خالی کرچکا تھا اس لیے اس لڑکی نے یہ اندازہ لگایا کہ شاید وہ بہت بھوکا ہے لڑکی نے اس کے ہاتھ سے پلیٹ لے کر کہا، "بابا معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت بھوکے ہو بیٹھو میں اور لاتی ہوں۔" انور میں خوف کی وجہ سے بولنے کی سکت تک نہ تھی، دوسرے حلق میں نوالے پھنسے ہوئے تھے، اس لیے دونوں نے کی زبان ہلانے کے بجائے دشمن کا سر انکاری صورت میں ہلا دیا۔ جب دونوں پلاؤ پر ہاتھ صاف کرکے جانے لگے تو لڑکی نے کہا، "بابا! میں اس سال دسویں کا امتحان دے رہی ہوں دعا کرنا کہ پاس ہوجاؤں۔" نسیم ضعیفانہ لہجے میں بولا، "اللہ پر توکل رکھو بیٹی! تم بڑی اچھی ہو، تم ہمیں اپنا نام اور رول نمبر بتادو! میں کچھ پڑھ پڑھا دوں گا۔ انشاءاللہ ضرور کامیاب ہو جاؤ گی۔ لڑکی نے نہ صرف اپنا نام اور رول نمبر بتا دیا بلکہ پانچ رُپے کا نوٹ بھی ہاتھ میں تھما دیا۔

جب میٹرک کے نتیجے کا اعلان ہوا تو انور اور نسیم کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے حالاں کہ وہ ان دونوں کے لیے خوشی کا دن تھا، کیوں کہ انور اور نسیم دونوں کامیاب تھے لیکن وہ صاحبہ...... فیل تھیں۔

بغداد کا سوداگر

ارشاد احمد سیفی۔ کراچی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بغداد کے ایک تاجر کو ایک قافلے کے ساتھ عمان جانا تھا۔ مگر بے چارہ بدقسمتی سے بیمار پڑ گیا۔ اس کے پاس ریشمی کپڑے کے چند تھان تھے۔ اس نے ایک اونٹ والے سے جس کے ساتھ اسے عمان جانا تھا۔ کہا کہ وہ اُس کے ریشم کے کپڑے کے تھان عمان لے جائے، جب اس کی بیماری ختم ہوجائے گی، وہ خود عمان کو روانہ ہوجائے گا۔

اونٹ والا عمان کو روانہ ہوگیا اور آخر کار چند دن کی مسافت کے بعد وہ عمان پہنچ گیا۔ وہاں

جاکر ایک سرائے میں تاجر کا انتظار کرنے لگا۔ دو تین روز اس نے تاجر کا انتظار کیا مگر وہ عمان نہ پہنچا۔ اب اونٹ والے کی نیت خراب ہوگئی۔ اس نے ریشم کے تمام تھان بیچ دیے۔ کپڑے بیچنے کے بعد اس نے اپنا بھیس بدل دیا۔ اس نے قیمتی کپڑے خریدے اور اپنے سفید بال رنگوالیے۔

ادھر جب بغداد کے سوداگر نے بیماری سے نجات حاصل کی اس نے عمان کی طرف سفر کرنا شروع کر دیا اور ہفتوں کی مسافت اور مصیبتیں جھیلنے کے بعد وہ عمان پہنچ گیا۔ مگر وہاں اونٹ والے کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بہت گھبرایا کہ اس مصیبت کا کیا بنے گا۔ آخر ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس نے اونٹ والے کو ایک دن پہچان لیا اور اس سے ریشم کے تھانوں کا تقاضا کیا۔ اونٹ والے نے جواب دیا کہ اسے غلط فہمی ہوگئی ہے وہ اونٹ والا نہیں ہے بلکہ سمرقند کا ایک مشہور تاجر ہے۔ مگر تاجر نہ مانا اور عدالت میں دعوا کر دیا۔ جج نے کہا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا کیوں کہ گواہی دونوں کے پاس نہیں ہے۔ اونٹ والا خوش ہوکر واپس جانے لگا۔ جیسے ہی وہ دروازے کے پاس پہنچا جج نے اسے اچانک پکارا "اونٹ والے ادھر آ!" اونٹ والا پلٹ کر جج کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا بات ہے۔ جج نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ اونٹ والے کو حراست میں لے لیں اور جیل بھیج دیں۔ جیل میں جبراً اس سے تاجر کے ریشمی تھانوں کے پیسے لیے گئے اور تاجر کو واپس دے دیے گئے اور اس کو سات سال قید کی سزا دی گئی کسی نے سچ کہا ہے کہ ؎

"صداقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے"

لطیفے

غلام سرور۔ لاہور

آقا نوکر سے :۔ جلدی بتاؤ پینسل کہاں ہے۔
نوکر :۔ حضور آپ کے کان پر۔
آقا :۔ کون سے کان پر میرے پاس سوچنے کا وقت نہیں

ماسٹر:۔ دس روپے کے آنے بناؤ؟
شاگرد:۔ معاف کیجیے جناب پولیس پکڑ لے گی کیوں کہ سکہ بنانا سخت جرم ہے۔

مالک : (نوکر سے) چینی کیا بھاؤ لائے ہو؟
نوکر :۔ جناب دو روپے سیر۔
مالک :۔ بلیک مارکیٹ سے ؟
نوکر :۔ نہیں جناب اکبری منڈی سے

ملزم :۔ (دوست سے) ارے مجھے تو سزائے موت کا حکم ہوگیا ہے۔
دوست:۔ (ملزم سے) خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پھانسی کی سزا نہیں ہوئی۔

سائنس ماسٹر:۔ اچھا یہ بتاؤ اگر سونے کو کھلی ہوا میں رکھ دیا جائے تو کیا ہوگا؟
شاگرد:۔ جناب، چوری۔

انسپکٹر:۔ (طالب علم سے) باغ سے سیب توڑنے کا وقت کونسا ہے؟
طالب علم:۔ جب باغ میں کوئی مالی موجود نہ ہو۔

مالی کا ایمان دار لڑکا



ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ابراہیم نامی ایک مالی تھا، وہ بڑا متقی اور پرہیزگار آدمی تھا اور بادشاہ کے سب سے اچھے باغ کی نگرانی کا کام اس کے سپرد تھا، اس باغ میں قریب قریب سب پھلوں کے درخت تھے، لیکن آموں کے درخت زیادہ تھے۔

ابراہیم ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں اپنے ایک آٹھ سال کے لڑکے اختر کے ساتھ رہتا تھا، باغ کی دیکھ بھال سے جو وقت اسے بچتا تھا، ابراہیم خدا کی عبادت اور اپنے لڑکے کو اچھی اچھی باتیں سکھانے میں صرف کرتا تھا، اسی طرح پانچ سال گزرنے کے بعد اختر اس قابل ہوگیا کہ باغ کی نگرانی اور اس کے رکھ رکھاؤ میں باپ کی مدد کرنے لگا۔

آموں کے موسم میں درختوں میں بڑی کثرت سے آم آئے۔ شاخیں آموں کے بوجھ سے جھک گئیں ایک دوسری جھونپڑی تیار کی گئی اور اس میں مختلف قسم کے آموں کی علیحدہ علیحدہ پال ڈالی گئی، اختر نے اس کام میں اپنے باپ کی بہت مدد کی۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ ابراہیم بخار میں مبتلا ہوگیا، اختر نے اس کی بڑی خدمت کی اور اپنا سارا وقت اس کی تیمارداری میں صرف کرنے لگا۔ وقت کی بات ہے، اسی دن بادشاہ اپنے دوستوں کے ساتھ باغ کی سیر کو آیا۔

جب بادشاہ نے ابراہیم کو طلب کیا تو اختر نے بادشاہ سے عرض کیا کہ اس کا باپ بخار میں مبتلا ہے۔ اختر نے ایک گھنے درخت کے سایہ میں بادشاہ اور اس کے دوستوں کے لیے ایک قالین بچھایا اور جو کھانا وہ اپنے ساتھ لائے تھے، اسے سلیقے سے لگا دیا، پھر دوڑ کر قریب کے کنویں سے ٹھنڈا پانی لایا۔

کھانا کھانے کے بعد بادشاہ نے اختر سے کہا کہ تھوڑے سے عمدہ میٹھے آم لاؤ، اختر دوڑا ہوا اپنی جھونپڑی میں گیا۔ باپ غافل پڑا سو رہا تھا، اختر نے اُسے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور سیدھا اس جھونپڑی میں پہنچ گیا جس میں آموں کی پال ڈالی گئی تھی اور چند بہت عمدہ سُرخ خوشبودار آم چھانٹ

کر بادشاہ کے حضور میں پیش کیے۔ بادشاہ ان آموں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا، مگر اتفاق ایسا ہوا کہ جب وہ آم کاٹ کر کھائے گئے تو ترش نکلے۔

بادشاہ کو بہت غصہ آیا۔ اس نے چیخ کر اختر سے کہا، "تم ہمارے لیے ترش آم کیوں لائے، جاؤ! میٹھے آم لے کر آؤ۔"

اختر نے ادب سے جھک کر عرض کیا، "حضور مجھے بتا دیجیے کہ کن درختوں میں میٹھے آم ہیں تو میں وہ آم حاضر کروں۔"

بادشاہ کو بڑا تعجب ہوا، اس نے اختر کی طرف حیرت سے دیکھ کر کہا، "تم بچپن سے اس باغ میں رہتے ہو اور تم یہ نہیں جانتے کہ میٹھے آم کن درختوں میں لگتے ہیں، یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔"

اختر نے بہت عاجزی کے ساتھ جواب دیا، "حضور! میں بچپن سے اس باغ میں رہتا ضرور ہوں مگر جب میں چھوٹا سا بچہ تھا تو کئی دفعہ میرا جی چاہا کہ میں آم یا کوئی اور پھل توڑ کر کھاؤں مگر میرے خدا سے ڈرنے والے باپ نے مجھے روکا اور کہا، "بیٹا اس باغ کے سب پھل بادشاہ کے ہیں، ہمارے نہیں ہیں، تم ان پھلوں کو کبھی نہیں کھانا۔ تو حضور پھر مجھے کیوں کر معلوم ہو سکتا تھا کہ کون سے پیڑ کے آم میٹھے ہیں۔"

بادشاہ کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے کہا، "کیا سچ مچ تم نے کبھی اس باغ کا کوئی آم نہیں چکھا ہے؟" اختر نے جواب دیا، "نہیں حضور! میں نے اس باغ کا کبھی کوئی آم نہیں چکھا ہے۔"

بادشاہ نے کہا، "اختر تم بڑے اچھے لڑکے ہو، ابراہیم بڑا خوش قسمت ہے کہ خدا نے اسے ایسا سعادت مند لڑکا دیا ہے جو باپ کے حکم کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔"

اس کے بعد بادشاہ نے اختر کی تعلیم کا بہت اچھا انتظام کر دیا۔ وہ بادشاہ کے دو لڑکوں کے ساتھ ہی تعلیم پانے لگا۔ اختر نے بہت محنت سے تعلیم حاصل کی، اس کے استاد اس سے بہت خوش تھے وہ بہت ذہین، طباع اور سمجھ دار لڑکا ثابت ہوا۔ اب اس کے باپ کا بڑھاپا تھا، جو وقت پڑھنے لکھنے سے بچتا، وہ اپنے باپ کی خدمت کرنے میں صرف کرتا۔

جب اختر نے تعلیم سے فراغت پائی تو اس کی قابلیت اور اس کی دیانت کی سب ہی تعریف کرنے لگے۔ بادشاہ جو اب بوڑھا ہو گیا تھا، اختر کو بہت پسند کرتا تھا اور اُسے اس پر بڑا اعتماد اور بھروسا تھا، اس نے اختر کو اپنی سلطنت کا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔

اس طرح ایک غریب مالی کے لڑکے نے اپنی ایمان داری اور نیک نیتی سے بادشاہ کو متاثر کیا اور خدا نے اس کی مدد کی اور اُسے سلطنت کے سب سے اونچے عہدے پر سرفراز کیا۔



ڈاکٹر صاحب

عمر علوی شاہین

ڈاکٹر نجیب کی ڈسپنسری چندر گھونہ سے کیتائی جانے والی سڑک پر واقع تھی۔ چونکہ آس پاس کسی دوسرے ڈاکٹر یا حکیم کی دُکان نہ تھی اس لیے ان کی پریکٹس اچھی چل رہی تھی مگر نہ معلوم کیوں وہ ہمیشہ آمدنی کی کمی کا شکوہ کرتے رہتے اور اسی کوشش میں رہتے کہ کسی صورت سے زیادہ سے زیادہ رُپے ان کی جیب میں آجائیں۔

ایک دن پانچ بجے وہ حسب معمول کرنا پھولی کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے۔ آفتاب سیتا پہاڑ کی بلند چوٹیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ان کے کپڑوں سے اٹھکھیلیاں کر رہی تھی اور پہاڑوں کی ڈھلانوں پر اُگے ہوئے دھان کے سنہرے پودوں پر سورج کی کرنیں رقص کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب ان مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ انھیں اچانک اپنی طرف ایک شخص آتا ہوا نظر آیا۔ وہ تراش خراش سے بہت امیر معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سرخ و سفید چہرہ پر گہری شکنیں پڑی ہوئی تھیں، وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا اور کہا۔

"کیا ڈاکٹر نجیب آپ ہی ہیں؟"

"جی ہاں!" ڈاکٹر نجیب نے جواب دیا، "یہی ناچیز نجیب ہے، فرمائیے۔"

"تو ڈاکٹر صاحب میں رشید احمد ہوں میرا لڑکا صفدر سخت بیمار ہے، کیا آپ میرے گھر تک چلنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟"

"ضرور ضرور!" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا اور ایک نظر گرد و پیش کے مناظر پر ڈالی، گویا انھیں الوداع کہہ رہے ہوں۔ مہرِ عالم تاب اپنا سفر ختم کر کے سیتا پہاڑ کے پیچھے آرام کر رہا تھا اور افق پر پھیلی ہوئی سرخی کا عکس کرنا پھولی کے پانی پر لوٹ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک بھرپور سانس لی اور رشید صاحب کے ساتھ چل دیے۔

رشید صاحب کا لڑکا صفدر بہت تیز بخار میں مبتلا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹمپریچر دیکھنے کے لیے تھرمامیٹر

لگایا۔ ٹمپریچر دیکھا اور نسخہ لکھ دیا۔ چلتے وقت رشید احمد صاحب نے دس رُپلے کا ایک نوٹ ڈاکٹر صاحب کی نذر کیا جسے انھوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔

آج جب وہ گھر لوٹے تو بہت خوش تھے کیونکہ انھیں بغیر کسی حجت کے دس کا نوٹ مل گیا۔ بہت سے آدمی تو ڈاکٹر کی فیس دینے کے قائل ہی نہ تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ قیمت تو دوا کی لی جاتی ہے یہ فیس کیا چیز ہے۔ بہت لوگ ایسے بھی تھے جو جب تک مکمل شفا نہ پالیتے تھے ایک پائی بھی دینا پسند نہ کرتے تھے۔ ایسے لوگوں سے ڈاکٹر صاحب بہت گھبراتے تھے مگر رشید صاحب نے بہت مہذبانہ طریقہ سے انھیں خود ہی دس رُپلے پیش کر دیے۔

دوسرے دن صبح کو جیسے ہی ڈاکٹر صاحب نے ڈسپنسری کھولی اور اپنی میز پر جاکر بیٹھے کہ انھیں رشید صاحب آتے نظر آئے۔ ڈاکٹر صاحب کی باچھیں کھل گئیں اور انھیں یقین ہو گیا کہ رشید صاحب آج پھر بلانے آئے ہیں اور آج پھر وہ دس کا ایک نوٹ پالیں گے۔

رشید صاحب ڈاکٹر صاحب کے پاس آئے اور کہا "ڈاکٹر صاحب کل آپ نے جو دوا لکھ کر دی تھی وہی لینے آیا ہوں۔"

"آپ کے لڑکے کی حالت کیسی ہے؟" ڈاکٹر صاحب پوچھ بیٹھے۔

"کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔" رشید صاحب نے جواب دیا۔

"اچھا میں آج آؤں گا۔"

"نہیں کوئی خاص ضرورت نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے محسوس کیا کہ دس کا نوٹ ان کی جیب میں پہنچ کر نکل گیا۔ انھوں نے کمپاؤنڈر سے رشید صاحب کو دوا دینے کو کہا اور اپنے کام میں لگ گئے۔

تیسرے دن ڈاکٹر صاحب رشید صاحب کے آنے کا انتظار کرنے لگے مگر جب وہ نہ آئے تو خود ہی شام کو رشید صاحب کے گھر گئے مگر ان کے پہنچنے سے قبل ہی رشید صاحب کا لڑکا مر چکا تھا

سب لوگ اس کے پلنگ کے گرد جمع تھے اور سسکیوں کی آواز گونج رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں سے دو آنسو نکالے اور خاموشی کے ساتھ منھ لٹکائے واپس آگئے۔ انھیں رشید صاحب کے لڑکے کے مرنے کا غم نہ تھا بلکہ غم اس کا تھا کہ ان کا آج یہاں آنا بے کار ہوا۔

اس واقعے کو چھے ماہ گزر چکے تھے۔ برسات کے موسم میں ایک صبح ڈاکٹر صاحب نے ڈسپنسری کھولی اور اپنی میز پر بیٹھ کر مریضوں کے آنے کا انتظار کرنے لگے کہ اچانک انھیں اپنے سامنے ایک پاگل آتا ہوا نظر آیا۔

پاگل سیدھا ان کی میز کے پاس پہنچا اور ان کی طرف انگلی اٹھا کر کہنے لگا۔ "قاتل ... قاتل ....

(باقی صفحہ ۴۲ پر)



حافظہ کا کمال

تم یہ بتا سکتے ہو کہ ۸ ر جولائی ۱۹۶۵ء کو کیا دن ہوگا، یا یہ بتا سکتے ہو کہ گزشتہ اتوار کو پاکستان کے لاہور ریڈیو اسٹیشن سے رات کو آٹھ بجے کیا پروگرام نشر ہوا تھا؟

اسی قسم کی باتیں انگلستان کا ایک نابینا، لنگڑا، لولا، معذور لڑکا "جیفرے جینٹ" بتا دیتا ہے۔ اس نے اپنے حافظہ کو حیرت انگیز طریقہ پر تیز کر لیا ہے۔ اسے ٹیلی وژن کے سیکڑوں پروگرام ازبر ہیں جنھیں وہ سلسلہ وار سناتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اب سے برسوں بعد کی کسی تاریخ کا دن بالکل صحیح بتا دیتا ہے۔ اس کے ذہن میں برطانیہ کا پورا نقشہ محفوظ ہے، اور وہ مختلف مقامات کا درمیانی فاصلہ بتا سکتا ہے، مثلاً وہ فوراً بتا دے گا کہ لندن سے برمنگھم کتنے فاصلہ پر ہے، غرض کسی قسم کے واقعات تم اسے ایک بار پڑھ کر سنا دو، اسے حفظ..... ہو جائیں گے۔

کبھی کبھی حافظہ کی عجیب قوت کی اور مثالیں بھی دنیا کے مختلف ملکوں میں ملتی رہتی ہیں جنگِ عظیم کے بعد ہی ایک مسلمان بزرگ اپنی چار سالہ بچی کو لے کر لکھنؤ آئے تھے، اس بچی کو سارا قرآنِ کریم حفظ یاد تھا، عمر کی تصدیق تو مشکل تھی مگر چہرے سے اور بات چیت سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ چار سال نہیں تو زیادہ سے زیادہ پانچ سال اس بچی کی عمر تھی۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی کہ "گرد کھم ہیشائر" کا ایک چار سالہ لڑکا آنے والے تین سال کی ہر تاریخ کا دن فوراً بتا دیتا تھا۔

اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز "ناٹنگھم" کا ایک تیرہ سالہ لڑکا تھا، جس کا دماغی توازن صحیح نہیں تھا مگر پھر بھی اس لڑکے کا دماغ گویا ایک قسم کی حسابی مشین تھا گو وہ کاغذ پر لکھ کر ایک معمولی سوال بھی حل نہیں کر سکتا تھا، اس سے پوچھا گیا کہ ۲۸۷ پونڈ کے کتنے پنس ہوتے ہیں، اسے شاید دس سیکنڈ بھی نہیں لگے کہ اس نے بالکل صحیح جواب بتا دیا۔

حال ہی میں ایک یوگوسلاوی نوجوان "پیٹر بیٹرودرچ" نے اپنے ریاضیاتی دماغ کا مظاہرہ کیا، ایک دن ذیل کے اعداد اس کے سامنے پیش کیے گئے:

۳۶۵، ۴۹۰، ۳۹۵، ۷۸۲، ۹۴۷، ۳۳۳، ۷۶۷، ۵۷۷، ۷۴۳، ۲۸۱، ۹۱۳
۵۱۲، ۸۸۸، ۳۹۲، ۱۴۸، ۳۲۱، ۹۵۷، ۳۸۲، ۱۸۳، ۹۴۱، ۲۷۴، ۰۹۱، ۴×۲، ۹۵۵
۹۲۴، ۴۴۸، ۹۱۰ اور ۹۳۔ اس نے چند منٹ تک ان کو غور سے دیکھا اور پھر ان سب اعداد کو بغیر کسی غلطی کے دہرا دیا۔

اگلے دن صرف یہی نہیں کہ اسے یہ سارے نمبر یاد تھے بلکہ وہ فوراً یہ بتا سکتا تھا کہ دسواں یا تینتیسواں یا سولھواں نمبر کون سا ہے۔

زمانۂ حال کے مدبّروں میں شاید فیلڈ مارشل "اسمٹس" کا حافظہ سب سے بہتر تھا۔ کہتے ہیں کہ پانچ ہزار کتابوں کی ایک لائبریری کی ہر کتاب کا انھیں اتنی اچھی طرح علم تھا کہ اگر کسی کتاب کے کسی پارے کا ذکر ان سے کیا جاتا تو فوراً یہ بتا دیتے تھے کہ وہ اس کتاب کے کس صفحہ پر ہے۔

"مولانا ابوالکلام آزادؒ کا حافظہ بھی بہت قوی تھا۔ "غبارِ خاطر" اور "ترجمان القرآن" یہ دونوں کتابیں انھوں نے جیل میں لکھیں اور محض حافظہ کی مدد سے ان کتابوں میں سیکڑوں کتابوں کے حوالے دیے ہیں۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں ایک شخص "ولیم وڈفال" لندن کے مشہور اخبار مارننگ کرانیکل کے پارلیمنٹری نامہ نگار تھے۔ پارلیمنٹ میں جو تقریریں کی جاتی تھیں ان کے نوٹ لینا ممنوع تھا اور ان دنوں رپورٹروں کی گیلری بھی دارالعوام میں نہیں تھی۔ وڈفال بلا ناغہ پبلک گیلری میں جا کر بیٹھتے تھے اور ہر تقریر کا ایک ایک لفظ اپنے حافظہ میں محفوظ کر لاتے تھے اور اگلے دن اخبار میں شائع کر دیتے تھے۔

یہ خیال بھی غلط ہے کہ سب بوڑھے آدمیوں کا حافظہ خراب ہو جاتا ہے۔ "لوگنور سسکس" میں ایک آدمی تھا جو اپنے حسابی حافظے کے لیے دور دور مشہور تھا۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں جب اس کی عمر ۹۱ سال تھی اس سے کہا گیا کہ ۳ پونڈ، ۷ شلنگ ۱۰ پنس، ۸ پونڈ ۱۲ شلنگ ۷½ پنس، ۴ پونڈ ۱۸ شلنگ ۵½ پنس، ۹ پونڈ ۱۶ شلنگ ۳¾ پنس اور ۷ پونڈ ۴ شلنگ ۸¾ پنس کو دس لاکھ سے ضرب دو۔ اس نے ٹھیک ۴۵ سیکنڈ میں بالکل صحیح جواب بتا دیے، گویا ہر سوال ۹ سیکنڈ میں حل کر دیا۔

آج کل سب سے زیادہ قوی حافظہ "سیلسڈن سرے" کے ایک اسی سالہ بزرگ "مسٹر ولیم باٹل" کا ہے۔ وہ کبھی کوئی چہرہ، کوئی نام یا کوئی نمبر نہیں بھولتے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں چار امریکی ڈاکٹروں نے ان کے دماغ کا معائنہ کیا تھا اور یہ رائے قایم کی تھی کہ باٹل کے دماغ کا وزن دنیا کے سب انسانوں کے دماغ سے زیادہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ باٹل کے دماغ کا وزن ۶۹ اونس ہے "نپولین" کے دماغ کا وزن ۶۶.۵ اونس تھا۔



نسخہ لکھ کر دینے کے بعد، ایک اچٹتی سی نظر میں نے باقی ماندہ مریضوں پر ڈالی، اور مطمئن ہوگیا کہ کم از کم آدھ گھنٹہ تو یہ لوگ ضرور لیں گے۔ حفظِ ماتقدم کے لیے پھر بھی چھپی چھپی نظروں سے مولوی صاحب کو تاکا، جو پوری بنچ پر آدھے لیٹے اخبار "چاٹ" رہے تھے۔ شاید دل کی آنکھوں سے انھوں نے مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا، جھٹ اخبار سے نظریں ہٹا کر، چشمہ کھسکا کر مجھے دیکھا اور یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ میں ان پر سے نظریں ہٹا کر ان سے اپنی بے توجہی بھی تو ظاہر نہ کر سکا۔

"اوہو! تو حکیم صاحب ..... فارغ ہوگئے آپ؟" ٹانگیں سکیڑ کر وہ سیدھے ہو بیٹھے، اور میرا دل دھک دھک کرنے لگا کہ اب آئی کم بختی!

"نہیں جی! ..... ابھی کہاں ..... ابھی تو یہ سب صاحبان باقی ہیں۔" میں نے بنچ پر بیٹھے ہوئے مریضوں کی طرف بے چارگی سے اشارہ کیا، گویا امید ہو کہ یہ سب بھی میری تائید میں سر ہلا دیں گے اور مجھے مصیبت کے اس جال میں پھنسنے سے بچا لیں گے۔

"آپ تھک ضرور گئے ہیں، ..... آپ کے چہرے سے تھکن ظاہر ہو رہی ہے۔" انھوں نے خواہ مخواہ مجھے تھکن کا احساس دلایا۔ "اس وقت تو آپ کا چہرہ دیکھ کر مجھے وہ "کام ہے" اور "شام ہے" والی غزل کا وہ شعر یاد آ رہا ہے ... وہ ہے نا!" اور میں سٹپٹا گیا، غضب خدا کا یہ شخص آخر کب میرا پیچھا چھوڑے گا۔ آخر کیوں یہ میری مروّت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مجھ سے چپک گیا ہے۔ بوکھلا کر منھ پھاڑ دیا۔

"ارے ہاں، ہاں ..... وہ والا شعر! آہا ... واہ" اور جھٹ اس مریض کی طرف متوجہ ہو گیا جو اپنا نمبر آنے پر آگے کھسک آیا تھا، اور اپنا وجود ظاہر کرنے کے لیے کہ میں بھی یہاں بیٹھا ہوں آگے کی طرف کھسکا جا رہا تھا اور اسی طرح وہ سرکتا رہتا تو مجھے خطرہ تھا کہ وہ بنچ سے ہوتا ہوا میری میز پر آ جاتا۔

"ہاں جی! تو کیا شکایت ہے آپ کو؟" میں نے بظاہر مولوی صاحب سے لاپروا ہو کر اس کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر دی، مگر میرے ذہن میں مولوی صاحب کا غصے سے سرخ چہرہ گھوم رہا تھا اور میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اپنے شعر

کی اس بے قدری پر وہ اپنا نچلا ہونٹ چبا رہے ہیں اور ناک بھوں چڑھا رہے ہیں ۔ مگر میں مریض سے خواہ مخواہ سوالات کرکے طول دیتا رہا کہ مولوی صاحب بور ہو کر یا تو اخبار کو دوبارہ سہ بارہ پڑھنا شروع کر دیں کہ میں آخری مریض کو دیکھ کر اٹھوں اور وہ پکڑ کر مجھے رات کہی ہوئی غزل سنانی شروع کر دیں، یا پھر میری اس بدذوقی کا بڑا امکان کہ یہاں دوبارہ آنے کی کوشش نہ کریں ۔ مگر صاحب واہ، شاباش ہے میرے شیر کو، دیواروں کو یا مریضوں کو شعر سنا کر پھر اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ اور جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ مولوی صاحب کی "نظر کرم" اس طرف نہیں تو مریض کے ہاتھ میں جلدی سے نسخہ تھما کر دوسرے کی طرف متوجہ ہو گیا کہ کہیں ایک لمحہ بھی میں مولوی صاحب کو فارغ نظر آیا اور انھوں نے لوازنا شروع کیا ۔ وہ صاحب منھ پھاڑے مولوی صاحب کو گھور رہے تھے گویا پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں، لانبے لانبے بال جو تیل اور کنگھے سے بالکل بے نیاز تھے، شیو بڑھا ہوا، بوسیدہ شیروانی کے نیچے سے کھلا، بٹنوں سے بے نیاز قمیص کا گریباں جھانک رہا تھا اور چہرے سے ایسی یتیمی برس رہی تھی گویا کسی کو ابھی ابھی دفن کرکے آرہے ہوں !

"فرمائیے !" میں نے انھیں متوجہ کرنے کی کوشش کی ۔ جواب میں انھوں نے نہایت آہستگی سے مولوی صاحب کی طرف سے گردن موڑی، ایک نظر مجھ پر ڈالی گویا اندازہ لگا رہے ہوں کہ میں قابل اعتماد ہوں یا نہیں، اور کھوئی کھوئی نظروں سے میز پر پڑے ہوئے پیپر ویٹ کو گھورنے لگے ۔ میں انتظار ہی کرتا رہا کہ وہ مدعا بیان کریں ۔ مگر جب اس عالم محویت نے طول کھینچا تو دوبارہ بولنا پڑا ۔

"فرمائیے صاحب ! کیا تکلیف ہے آپ کو؟"

"آہا" انھوں نے ایک ضرورت سے زیادہ لمبی سانس کھینچی "کوئی ایک تکلیف ہو تو کہوں بھی، یہاں تو "ایک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے" والا معاملہ ہے"

میں جھنجلا سا گیا کہ یہ شخص خود بھی بور ہے اور مجھے بھی بور کرنے کی خواہ مخواہ کوشش کر رہا ہے۔ دراصل میں قطعاً اس موڈ میں نہیں تھا کہ اس شخص کی شاعرانہ باتوں اور اداکاری سے لطف اندوز ہوں اگر مجھے یہی کرنا تھا تو کیا مولوی صاحب کم تھے؟

"پھر بھی :" غصہ کو ضبط کرتے ہوئے حلیمی سے میں نے کہا ۔ کیا کیا جائے یہ پیشہ ہی ایسا ہے۔ وہ شاید میری جھنجلاہٹ بھانپ گئے ۔

"کل شام سے میرے سر میں عجب سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سر سے بھیجا نکال کر کسی نے ٹھونس ٹھونس کر روئی بھر دی ہو ...... ساری ساری رات نیند نہیں آتی ...... قبض الگ ہو رہا ہے اور ......"

"آپ شاعر ہیں ؟" میں نے بات کاٹ کر قطعی بے موقع سوال کیا۔ میں پہلے ہی جان گیا تھا کہ یہ کوئی انقلابی قسم کے شاعر ہیں، وہ گویا اسی بات کے متوقع تھے ۔

"ہی ہی ہی ...... شاعری کیا بس یوں ہی تُک بندی کر لیا کرتا ہوں" کھیسیں نکال کر وہ خاکساری جتانے لگے اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں مولوی صاحب متوجہ ہو چکے تھے ۔

"کون ہے بھئی شاعر؟" انھوں نے ہانک لگائی اور بیٹھے ہوئے مریضوں کو اس طرح گھور گھور کر دیکھنے لگے کہ

ان میں واقعی کوئی شاعر یا اس قسم کی چیز ہو تو فوراً گلے سے لگا لیں۔

"جی! اس خاکسار کو اس بڑے نام سے پکارا جاتا ہے" از خود اٹھ کر تعارف کرایا۔

"آہا ہا ہا..... واہ واہ" مولوی صاحب اپنی بنچ پر اٹھے۔ گویا بنچ نے چٹکی بھر لی ہو۔ پاس آکر ٹھٹک گئے۔

"آپ کا اسم شریف؟"

"جی! خاکسار کو دلؔ مراد آبادی کہتے ہیں" نہ جانے کیوں وہ اپنے آپ کو خاکسار کہہ کہہ کر خاکسار ثابت کرانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

"اچھا اچھا..... واہ واہ" مولوی صاحب چہکے گویا یہ بھی کوئی زوردار مصرع ہو" بندے کو اثرؔ کہا جاتا ہے" اور پھر گرم جوشی سے ملے اور انھیں گھسیٹ کر اپنی بنچ تک لے گئے۔

"چلو اچھا ہوا..... اب یہ باذوق مل گئے ایک دوسرے سے" میں نے سوچا اور مریضوں کو دیکھنے لگ گیا۔

دراصل یہ میری اس روایتی مروّت کا نتیجہ ہے کہ روز صبح مولوی صاحب مطب میں آدھمکتے ہیں، اخبار پڑھتے ہیں، مجھ سے سیاست پر گفتگو کرتے رہتے ہیں اور جہاں مجھے ذرا فرصت میں دیکھا اور سیاست سے بات کو اپنی رات کو کہی ہوئی غزل یا نظم پر لے آئیں گے اور جب تک مجھے مسلسل ایک گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سنا سنا کر بور نہیں کر دیں گے پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ بدقسمتی سے میں اس معاملے میں بڑا بدذوق واقع ہوا ہوں مگر یہ روایتی مروّت جو میرے ساتھ بری طرح چپک گئی ہے مجھے سننے پر مجبور کرتی ہے اور سننے کے لیے ہی کیا بلکہ داد بھی دینی پڑتی ہے۔

اور جب میں نے ادھر دیکھا تو بڑے گھل مل کر باتیں ہو رہی تھیں۔ دلؔ صاحب کہہ رہے تھے "کیا بتایا جائے صاحب! آج کل اہل ذوق کہاں ملتے ہیں۔ ہاں صاحب وہ زمانے کہاں رہے جب کہ شاعر کی ہر طرح عزت کی جاتی تھی۔ اب تو یہ حالت ہو گئی ہے کہ..... پانچ دن سے حالیہ انقلاب پر ایک نظم کہہ رکھی ہے مگر کوئی سننے والا نہیں ملتا..... بتایئے شاعر کی ہمت افزائی کیسے ہو؟" اور میری سمجھ میں آ گئی کہ محض اس وجہ سے کہ انھیں نظم کسی کو سنانے کو نہیں ملی ہے ان کے دماغ میں بقول ان کے ردی بھر گئی ہے۔ اور جب میں آخری مریض کو دیکھ کر کھانا کھانے گھر جا رہا تھا تو دلؔ صاحب اپنی نظم سنا چکے تھے اور اثرؔ صاحب کی غزل بڑے خوش خوش سن رہے تھے اور واہ واہ کے ڈونگرے برسا رہے تھے۔ چلتے چلتے میں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے انھیں نسخہ بتانا چاہا۔

"آپ سر کے اس مرض کے لیے....."

"نہیں صاحب! میرے سر کا درد تو نہ جانے کہاں بھاگ گیا.....آپ کے دواخانے میں آنے کے بعد تو رفتہ رفتہ غائب ہو رہا تھا اور اب اثرؔ صاحب کی شیریں بیانی اور صوفیانہ کلام نے تو بالکل ہی ختم کر کے رکھ دیا۔ واہ واہ..... سبحان اللہ"

بقیہ ننھے سوار کی انوکھی چال

اور آگ کی گرمی سے لطف اٹھاتا اور آہستہ آہستہ گنگناتا رہا۔

(۵)

وہ لوگ دروازے کے قریب جہاں گھوڑا بندھا ہوا تھا پہنچے تو اس کے سامنے نہ گوشت پایا نہ چائے نہ قہوہ۔ انھیں اس گھوڑے میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ وہ بھی اور تمام گھوڑوں کی طرح دانہ، بھوسا اور جَو کھا رہا تھا۔

یہ دیکھ کر انھیں بہت غصہ آیا۔ اپنی جگہ واپس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ لڑکا آتش دان کے پاس اکیلا بیٹھا ہوا مزے لے لے کر یہ گیت گا رہا ہے:

اگر دل سے ہو اپنی راحت کے خواہاں — کہ دنیا میں پاؤ فراغت کا ساماں
تو اوروں کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھو — محبت سے تم ان کو اپنا بنا لو
سلوک ان سے اچھا اگر تم کروگے — خود اپنی تمنا کا دامن بھروگے
سر آنکھوں پہ اپنی جگہ دیں گے تم کو — وہ آنکھوں کا تارا بنالیں گے تم کو
جو رکھتے ہو ان سے بدی کا رویّہ — تو ان سے بھی امید کوئی نہ رکھنا

ہمدردِ نونہال

اور ہمدرد صحت اور ہمدرد میڈیکل ڈائجسٹ مندرجہ ذیل ایجنسیوں سے مل سکتا ہے اپنے شہر کی ایجنسی سے یہ رسائل خریدیے

۱۔ ملک اینڈ سنز
کرشیل بلڈنگ ریلوے روڈ سیالکوٹ شہر

۲۔ اُجالا بک اسٹال
اسٹیشن روڈ چاٹگام مشرقی پاکستان

۳۔ صادق کمیشن ایجنسی
بازار قصہ خوانی پشاور شہر

۴۔ صادق کمیشن ایجنسی
بازار بجٹ گنج مردان

۵۔ دی بک سیلر
بالمقابل جی۔پی۔او۔ایم۔اے جناح روڈ
چاٹگام

۶۔ شیخ محمد ریاض صاحب
ایجنٹ ریلوے بک اسٹال لالہ موسیٰ

۷۔ عبدالغفور بک اسٹال
گاڑی کھاتہ چوک حیدرآباد (سندھ)

۸۔ آرمی بک اسٹور
نزدیک ڈاکٹر اے۔آر۔خاں
دی مال روڈ کوہ مری

۹۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز
ریلوے بک اسٹال روہڑی

۱۰۔ فدا حسین صاحب ایجنٹ
ریلوے بک اسٹال ملتان کینٹ

۱۱۔ چوہدری محمد رفیع ناصر صاحب
ناصر دواخانہ گول بازار ربوہ ضلع جھنگ

۱۲۔ میڈیسنل سابق ایجنسی ہمدرد
۹۔ کچہری روڈ پشاور

۱۳۔ چوہدری بشیر امانت علی اینڈ برادرس
خانپور

۱۴۔ ایجنسی ہمدرد دواخانہ
۶۔ گول چوک سرگودھا

۱۵۔ عبدالحلیم صاحب پاک بک ڈپو
مسجد روڈ نواب شاہ

۱۶۔ ریلوے بک اسٹال
اسٹیشن حیدرآباد (سندھ)

۱۷۔ ریلوے بک اسٹال
اسٹیشن کیمبل پور

۱۸۔ ریلوے بک اسٹال
اسٹیشن نواب شاہ

۱۹۔ محمد رمضان صاحب
رمضان بک اسٹال بوہڑ گیٹ
ملتان شہر

۲۰۔ حشمت علی خان صاحب
فردوس نیوز ایجنسی اوکاڑہ ضلع منٹگمری

OV. 9
Hamdard-e-Naunehal
REGD. No: S. 1903

TITLE PRINTED AT THE NOVELTY ART PRESS AMIL ROAD, KARACHI-1